رہنمائے

اسلامی نظریہ حیات

(سوالاً جواباً)

بمطابق جدید نصاب

برائے امتحان بی۔اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

بتجدید نظر و اضافہ

غلام احمد حریری

...یم۔اے (عربی)، ایم۔اے (علوم
...سلامیہ)، ایم۔او۔ایل (عربی)،
...ضل السنہ شرقیہ۔ فاضل درسِ نظامی
...لوم اسلامیہ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی
لائلپور

امتیاز احمد سعید

ایم اے (علوم اسلامیہ)،
ایم۔اے (عربی)، جے۔ڈی۔ڈبلیو
پی۔ای۔ایس شعبہ علوم اسلامیہ
گورنمنٹ کالج لاہور۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور

اردو بازار لاہور

اشاعت اوّل	اگست [illegible]
" چہارم	اکتوبر [illegible]
تعداد	ایک ہزار
ناشر	افتخار احمد مجید
طابع	منظر حسین ظفر
مطبع	لائلپور نفیس پرنٹنگ پریس
ہدیہ	چار روپے پچاس پیسے

نقطۂ آغاز

پاکستان کا مقصدِ وجود ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے جسمیں مسلمان اسلامی نظریۂ حیات کے اصول وضوابط کے مطابق زندگی گذار سکیں اور اسلام کو ایک دین کامل اور ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے زندگی کے تمام شعبہ جات پر منطبق کر سکیں۔ دینِ اسلام کے بارے میں اس غلط فہمی کی تاریخ خاصی پرانی ہے کہ اسلام صرف ایک نظامِ عبادات ہے جسمیں طاعت وعبادت کے طور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل بحیثیت مجموعی مسلمانوں نے کبھی بھی اسلام کو ایک کامل نظامِ حیات کے طور سے دیکھنے اور اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ انگریز کے عہدِ اقتدار میں دینِ اسلام کے ناقص تصور کو اور شہ ملی اور یہ غلط اندازِ فکر عام طور سے جڑ پکڑتا چلا گیا تھا۔ اسلام کو عبادات کی حد تک محدود کرنے کے کچھ اسباب و وجوہ بھی تھے جو اس شعور کی پختگی کا باعث ہوئے۔ برِصغیر پاک وہند میں اسلام کے سوا جن مذاہب کا سکہ رواں تھا مثلاً ہندو مت۔ بدھ مت۔ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ ان میں سے کوئی بھی نظامِ زندگی ہونے کا دعویدار نہیں۔ پھر اسلام کا یہ انوکھا دعویٰ کسی کی سمجھ میں کیونکر آسکتا تھا؟ مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی دینِ اسلام کو چند رسوم تک محدود کر دیا۔ انگریز نے جس مذہبی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا تھا اس میں نماز روزہ کی اجازت اور محمڈن لا کے نام سے مسلمانوں کے چند مخصوص قوانین ضرور موجود تھے مگر وہ اسلام کو پوری زندگی پر منطبق کرنے کی اجازت آخر کیوں دیتا؟ اور اگر دیتا تو اسکے اپنے قانون کی کیا حیثیت ہوتی اور اسکا اقتدار کیونکر باقی رہتا؟

انگریز نے کشت زارِ ہند میں اسلام کے ناقص تخیل کا جو شجرۂ خبیثہ لویا تھا اسکے چلے جانیکے بعد بھی نہ صرف باقی رہا بلکہ خوب پھلا پھولا اور برگ و بار لایا۔ انگریز نے انگریزی زبان وادبیات کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و ثقافت اور غلامانہ طرزِ فکر [illegible] بھی تحفہ دیا

تھا وہ اسلام کے ادھورے تصور کو ہوا دیتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کی توقعات نہ ہو سکیں، ضرورت اس بات کی داعی تھی کہ نئی پود کے قلب و ذہن کو اسلام میں ڈھالنے کے لیے ان کے دل کی گہرائی میں یہ بات اتار دی جاتی کہ دینِ اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی کرنے ہی سے دنیوی کامرانی و شادمانی اور اخروی صلاح و فلاح وابستہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کا ناقص تخیل دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ لہذا جلد از جلد غلامی کی اس یادگار کو مٹانا ضروری ہے۔

کراچی یونیورسٹی کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے کہ اس نے "اسلامی نظریۂ حیات" کے نام سے ایک مبسوط کتاب شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کسی ایک مصنف کی تحریر کردہ نہیں بلکہ ملک کے مشہور مصنفین کی کتب کے اقتباسات کی جامع ہے۔ سالِ رواں میں پنجاب یونیورسٹی نے اس کتاب کا پہلا اور تیسرا حصہ بی۔اے کلاسز کے طلبہ علوم اسلامیہ کے نصاب تعلیم کے طور پر مقرر کیا ہے۔ چونکہ کتاب دقیق و عمیق افکار و مسائل پر مشتمل تھی دوسرے پہلا حصہ، جن کا فہم و ادراک طلبہ کے لیے چنداں آسان نہیں۔ اس لیے ہم نے ملک کے ایک مشہور اہل علم و قلم عربی زبان و ادب کے فاضل اور تجربہ کار پروفیسر سے رہنما "اسلامی نظریۂ حیات" کے نام سے یہ کتاب لکھوائی۔ مؤلف نے طلبہ کو کتاب کے اندراجات سے روشناس کرانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ بعض جہاں مضمون تشنۂ تکمیل تھا اپنی طرف سے مفید اضافے بھی کئے ہیں۔ تفہیم مطالب کے لئے سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کے بعد سوالات صفحۂ ذہن پر ابھر سکتے تھے کتاب کی روشنی میں ان کا جواب دیا گیا۔ بہر کیف کتاب کو سمجھانے سے متعلق جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ امید ہے کہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ و طلبہ ہماری ناچیز خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ہمیں اپنے زرین مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور

فہرست

ص

اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلام کے تقاضے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سوال : دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ دین اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔

جواب : دین اسلام کو دیگر مذاہب میں جو خصوصی امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ وہ رائج الوقت مذاہب کی طرح چند افکار و عبادات اور چند رسوم کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی وسعت سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے۔ اسلام انسان سے اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ جونہی وہ مسجد کی چار دیواری میں قدم رکھے اسلامی صفات کا زندہ پیکر نظر آنے لگے۔ اور جب مسجد کی حدود سے باہر نکلے تو اسلامی شعائر و احکام کے لبادہ کو اتار پھینکے۔ بخلاف ازیں اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہو اور انسان اپنی انفرادی و اجتماعی۔ معاشرتی و تمدنی۔ معاشی و سیاسی غرضیکہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی اسلامی ہدایات کو نظر انداز کرنے کا مرتکب نہ ہو۔

ارشاد باری ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (سورہ بقرہ)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

دراصل اسلام اس بات کا داعی بن کر آیا ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری ہو اور اس کائنات ارضی کے ہر گوشہ میں خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے ایک مشہور صوفی کا قول ذکر کر کے دور حاضر کے محدود مذہبی نقطہ نظر اور اسلام کے وسیع انقلابی زاویۂ نگاہ کا فرق بڑی خوبی سے واضح کیا ہے صوفی صاحب واقعۂ معراج پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں

"محمد عربی آخری آسمان پر گئے اور واپس آ گئے۔ خدا اگر میں جاتا تو کبھی لوٹ کر نہ آتا"

(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ مطبوعہ بزم اقبال لاہور صفحہ ۱۸۸)

اس ایک جملہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محدود مذہبی تصور اور انبیاء کے انقلابی نقطۂ نظر کے مابین کس قدر فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ جس شخص کے پیش نظر ذاتی اصلاح اور روحانی بلندی کا حصول ہوتا ہے وہ قرب الٰہی کے لئے اپنی تمام تر مساعی وقف کر دے گا اور جب یہ مقصد اسے حاصل ہو جائے گا تو وہ دنیا کی طرف لوٹنے اور اسکی آلودگیوں سے ملوث ہونے کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس کے عین برعکس ایک نبی معرفت ربانی کی بلندیوں پر پہنچ کر بنی نوع انسان کی اصلاح کے فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور جو نور ہدایت اسے بارگاہ ایزدی سے ملتا ہے اس کی مدد سے وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ انبیائے کرام کا سلسلہ دنیا میں اسی لئے جاری کیا گیا تھا کہ وہ دنیائے انسانی کی کایا پلٹ کر رکھ دیں اور ایک نیا معاشرہ قائم کریں۔ تمام انبیاء یہی مشن لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ سردار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فریضہ مکمل ترین اور معیاری شکل میں انجام دیا۔ اسلام انسانی زندگی کی ذمہ داریوں سے بھاگنے کا سبق نہیں دیتا بلکہ پوری زندگی کو سنوارنے کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے اسی نظام زندگی کو "دین" اور "اسلامی نظریۂ حیات" کہتے ہیں

دین کا مفہوم

سوال ۲: دین سے کیا مراد ہے۔ مختصراً بیان کیجئے۔

جواب: دین کا لفظ عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن میں چار معانی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو حسب ذیل ہیں

۱: کسی صاحب اقتدار کا غلبہ و تسلط

۲: اطاعت و بندگی

۳: طریق کار اور ضابطہ جس کی پیروی کی جائے۔

۴: جزا و سزا

قرآن کریم کی اصطلاح میں لفظ دین ایک ایسے نظام حیات سے عبارت ہے جو درج ذیل عناصر و اجزاء سے مل کر بنا ہو۔

۱: اللہ تعالیٰ کا حاکم اعلیٰ ہونا۔

۲: اس کی حاکمیت کے آگے سر نیاز جھکانا۔

۳: وہ کامل ضابطۂ حیات جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہو۔

۴: اعمال کی جزا و سزا۔

قرآنی اصطلاح میں دین سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کی حاکمیت تسلیم کرکے اس کی اطاعت قبول کرے۔ اس کے حدود و قیود سے تجاوز نہ کرے۔ اسکی اطاعت شعاری کو اپنے لئے موجب عزت و انعام اور اسکی نافرمانی کو باعث ذلت و سزا تصور کرے۔ حاکمیت اعلیٰ کا منصب صرف ذات خداوندی کو ہی سزاوار ہے۔ دین اسلام کی بنیاد خداوند تعالیٰ کی حاکمیت پر رکھی گئی ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم میں دین اسلام کی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(المائدہ ۵ - ۳)

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا۔

ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(آل عمران - ۱۹)

بے شک خدا کے نزدیک اصل دین اسلام ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

(آل عمران - ۱۹)

جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اسلام کے لغوی معنی سر جھکانے اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اسلام امن و آشتی اور صلح کو بھی کہتے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک نظام حیات پیش کر کے انسانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسکی پیروی کریں اور اسے اپنے لئے لائحہ عمل قرار دیں۔ لفظ اسلام سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو زندگی اطاعت خداوندی سے بہرہ ور ہوگی وہ انسانیت کے لئے صلح و امن اور رحمت و برکت کی پیامبر ہوگی۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دین اور اسلام دونوں الفاظ ایک ہی حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور معنوی اعتبار سے ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔

اسلامی نظریۂ حیات

سوال ۳: اسلامی نظریۂ حیات سے کیا مراد ہے؟

جواب: نظام زندگی ہونے کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں

۱ ایک پہلو نظری و فکری ہے۔ ایک طرف اسلام ہمیں زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کائنات ارضی میں انسان کا منصب و مقام کیا ہے؟ وہ دنیا میں کیوں آیا؟ حیات دنیوی میں اس کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟ خلیفۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کن افکار و عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے؟

۲ اسلامی تعلیمات کا دوسرا پہلو عملی ہے۔ ارکان اسلام کا مقصد یہی ہے کہ انسان نظری و فکری الجھنوں میں مشغول رہ کر عملی زندگی سے کٹ نہ جائے۔ عقائد اسی قدر ضروری ہیں جو فکری اصلاح کے لئے ناگزیر ہوں۔ عقائد میں غیر ضروری انہماک قوت عمل سے محروم کر دیتا ہے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات میں اعمال کو خاص حیثیت حاصل ہے عقائد اور ضابطۂ عمل کے مجموعے کا نام "اسلامی نظریۂ حیات" ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح "آئیڈیالوجی" کا لفظ ایسے ضابطۂ فکر و عمل پر استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی فکری و فلسفیانہ بنیاد رکھتا ہو اور تمدن و معاشرت کی گتھیاں سلجھاتا ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اور عبدالحق نے "لغت فلسفہ" میں آئیڈیالوجی کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "آئیڈیالوجی سے نظریات کا وہ ضابطہ یا پروگرام مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی فکر و فلسفہ پر رکھی گئی ہو۔"

مشہور ماہر لسانیات ویبسٹر اس کی لکھتا ہے۔

"کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرتی تحریک کے لائحہ عمل کے علمی بیان کو "آئیڈیالوجی"

کہتے ہیں"۔

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نظریۂ حیات سے کسی تحریک یا نظام تمدن کے وہ عقائد و افکار مراد ہوتے ہیں جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہوتی ہے۔ نیز وہ معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی لائحہ عمل بھی اس میں شامل ہے جو ان افکار سے ماخوذ ہوتا ہے۔ جب ہم "اسلامی نظریات" کی اصطلاح بولتے ہیں تو اس سے مراد وہ فکری نظام اور لائحہ عمل ہے جو اسلام نے پیش کیا۔

نظریہ حیات زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرتا اور انہیں روشنی عطا کرتا ہے جسطرح ایک لڑی ہار کے موتیوں اور تسبیح کے دانوں کو باہم مربوط کر دیتی ہے اسی طرح نظریہ حیات کی روح زندگی کے تمام شعبوں کو ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ یہ روح زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے۔ انسانی زندگی میں حسن و خوبی کے جو مظاہر نظر آتے ہیں وہ اسی یگانگت و ہم آہنگی کی پیداوار ہیں۔

مغرب کا اصل مسئلہ

سوال ۴: آیا اہل مغرب کے یہاں کوئی نظریۂ حیات ہے یا نہیں؟ تفصیلاً لکھئے۔

جواب: اسے یورپ کی بدقسمتی کہئے کہ وہ کسی نظریۂ حیات سے بہرہ ور نہیں ہے یورپ میں عیسائیت کا سکہ رواں ہے مگر وہ بھی اسے کوئی نظریۂ زندگی نہ دے سکی جسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود عیسائیت کا دامن اس سے خالی ہے۔ موجودہ عیسائیت

چند مذہبی رسوم کی ضرور حامل ہے مگر وہ زندگی کا کوئی لائحہ عمل پیش نہیں کر سکتی۔ یورپ میں کسی نظریۂ حیات کے فقدان کا نتیجہ آخر اس صورت میں برآمد ہوا کہ اہل یورپ نے اسکی ضرورت ہی سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ نظریۂ حیات ایک بیکار چیز ہے۔

یورپ کی انتشار خیالی آخر رنگ لائی اور زندگی کے ہر شعبہ میں افراتفری اور بدنظمی کے آثار نظر آنے لگے۔ عالمی ریاست کی جگہ قومی حکومت نے لے لی اور سلطنت روما چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا۔ معاشیات میں نفع اندوزی اور سرمایہ پرستی کا رجحان رونما ہوا۔

اہل مغرب چونکہ دین حق کی ضیاپاشیوں سے محروم ہیں اس لئے ان کے بے دین فلسفی زندگی کی گتھیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے سلجھانے میں مصروف رہے اور مربوط نظام فکر پیش نہ کر سکے۔ مثلاً سب سے پہلے ڈیکارٹ نے روح اور مادہ کی ثنویت (دوئی) کا عقیدہ اختراع کیا اور دونوں کو مستقل بالذات وجود قرار دیا۔ مشہور فلاسفر لائیبنز نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا کہ کائنات میں کارفرما وجود دو نہیں بے شمار ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا ہر جوہر (ایٹم) خود ایک کائنات ہے اور اپنا جداگانہ وجود رکھتا ہے۔ فلاسفہ اسی ڈگر پر گامزن رہے۔ لاک اور ہیوم نے روح کے مقابلہ میں مادہ کو افضل قرار دیا۔ ریاضیات اور طبعیات میں نئی نئی تحقیقات ہوئیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مغرب "کل" کو خیرباد کہہ کر "جزو" کے پرستار بن گئے۔

ان افکار و آراء کے پیش نظر اہل مغرب میں یہ رجحان ابھرا کہ کوئی ایک نظریۂ حیات ایسا نہیں ہو سکتا جو منتشر شعبہ ہائے زندگی میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کر دے۔ اہل مغرب لادینیت (SECULARISM) اور مادیت

(MATERIALISM) کی راہ پر گامزن ہیں۔ ظاہر ہے کہ لادینیت اور مادیت منفی تحریکیں تھیں وہ کوئی مثبت نظام زندگی پیش نہیں کر سکتی تھیں۔ اس طرز فکر نے مختلف شعبہ ہائے حیات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ چنانچہ معیشت و معاشرت اور اخلاق و تمدن کے درمیان کوئی ربط و ضبط باقی نہ رہا۔ اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی مگر شعبہ ہائے حیات کے مابین کوئی مربوط نظم قائم نہ ہو سکا۔ تاریخ کا طالب علم یورپ کی سیاسی جمہوریت کے بلند بانگ دعادی اور معاشیات میں نفع اندوزی کے جذبہ اور مزدوروں پہ مظالم دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ اس عملی تضاد کی اصل وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب لادینیت و مادیت پر متفق ہیں حالانکہ یہ ایک منفی چیز ہے۔ مگر ان کے یہاں کوئی مثبت نظریۂ زندگی موجود نہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں وحدت و یگانگت پیدا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی تہذیب میں ہر جگہ انتشار کے مظاہرے نظر آتے ہیں۔

اشتمالیت

سوال ۵: اشتمالیت (کیمونزم) زندگی کے مسائل حل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے؟ تبصرہ کیجیے۔

جواب: یورپ میں جو فکری انتشار نظریۂ حیات کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ کیمونزم (COMMOUNISM) اسکا توڑ مہیا کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا۔ چونکہ کیمونزم کے پاس ایک اپنا ضابطۂ حیات تھا اس لئے شروع شروع میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ دکھی انسانیت

نے اسے آلام روزگار کا واحد علاج تصور کیا۔ مگر جونہی اشتمالیت نے نظری و فکری حدود سے آگے بڑھ کر عمل کی دنیا میں قدم رکھا تو اس کی ناکامی کا راز طشت از بام ہونے لگا اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتمالیت خود ایک منفی تحریک تھی۔ اور اس کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی تھی کہ لوگوں کو مزدور و سرمایہ دار کے دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتمالیت کی تحریک صحت مند نظریۂ حیات پیش کرنے سے قاصر رہی تھی۔ مزید برآں اس کے یہاں مذہب و اخلاق کو سرے سے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ ان وجوہ و اسباب کی بنا پر کمیونزم میں اب لوگوں کے لئے کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی تھی

اس بات کا کیا علاج کہ دنیا میں ایک طرف تو صحت بخش نظریۂ حیات کا وجود کہیں نظر نہیں آتا اور دوسری طرف ایک ایسے ضابطۂ حیات کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جو زندگی کے مسائل کو صحت مند بنیادوں پر حل کرے۔ یہ ایک مسلّم صداقت ہے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ انسان کی شخصیت ایک ہی ہے۔ اور وہ بیک وقت دو متضاد کردار ادا نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنے کی صورت میں وہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ دور حاضر میں ہر طرف بے اطمینانی کے آثار نظر آتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش نوجوانوں کی سفلہ آوارگی اور دین سے بے گانگی اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ دور حاضر کا انسان ذہنی سکون و اطمینان کی دولت سے یکسر محروم ہے۔ انہی حالات کے پیش نظر پروفیسر جوڈ نے کہا تھا۔

> "ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا ہمیں ابھی تک نہیں آیا ہے۔"

پروفیسر جوڈ کے اس زرّیں ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ انسان نے اس سائنسی دور میں مادی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے۔ مگر مادی ترقی کے ساتھ ساتھ

اسکی روحانی و اخلاقی اقدار میں انحطاط رونما ہوگیا ہے۔ حالانکہ صحیح معنی میں انسان بننے کے لئے روحانی و اخلاقی ترقی بھی اسی قدر ضروری ہے جسقدر مادی ترقی۔ جب تک انسان اپنی زندگی کے یہ تقاضے پورے نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کی زمین پر ایک چلتا پھرتا حیوان ضرور ہے مگر اسے انسانیت کے بلند پایہ لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی کی وحدت

سوال ۶:۔ وحدت حیات سے کیا مراد ہے؟ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: یہ درست ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبے ہیں۔ مثلاً معیشت، سیاست، تمدن اور معاشرت وغیرہ۔ یہ شعبے بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق نظر آتے ہیں مگر ان میں حد درجہ ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ جسطرح ایک جسم کے اعضاء باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان کا باہمی ربط و تعلق ہی اعضاء کو ایک حسین و جمیل جسم کی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی مختلف و متنوع شعبہ ہائے حیات سے عبارت ہے جو باہم حد درجہ منسلک و مربوط ہیں۔ شعبہ ہائے حیات کا باہمی تعلق زندگی میں یک رنگی و ہم آہنگی پیدا کرکے اسے حسین و جاذب نظر بناتا ہے۔

جسطرح یہ بات قرین عقل و قیاس نہیں کہ ایک شخص کا نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نصف پر مسکراہٹ کا کوئی اثر نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ تنہا معیشت یا سیاست سے پوری زندگی میں دلکشی پیدا ہو جائے۔ ایک شخص اگر معاشی ترقی کا خواہاں ہو تو

لیے چاہیئے کہ وہ معاشرت، اخلاق اور عمرانیات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بیک وقت مختلف سمتوں میں چل سکے اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسکی زندگی کے سیاسی شعبے کا رخ مشرق کی طرف ہو اور معاشرتی شعبے کا رخ مغرب کی جانب۔

یہ حقیقت تجربہ کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے کہ تمدنی ترقی حاصل کرنے کے لئے جزو پسندی کے بجائے تہذیبی وحدت کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ پہلے زندگی کو ایک وحدت قرار دیا جائے اور پھر اس کے مختلف النوع شعبہ جات میں ہم آہنگی اور ربط و نظم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ بنی نوع انسان کو اس فکری انتشار سے نجات دلائی جائے جس سے وہ دوچار ہے اور جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اس انتشار کا واحد علاج ایک صحت مند نظریۂ حیات میں مضمر ہے۔ جب تک اس کائنات ارضی پر بسنے والے اسلام کے پیش کردہ نظام زندگی کو مکمل طور پر اختیار نہیں کر لیتے فکری انتشار کا ازالہ کسی طرح ممکن نہیں۔

وقت کی ضرورت

سوال ۔ دور حاضر کے فکری و عملی انتشار کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ دلائل کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب : دور حاضر میں متعدد ایسے اسباب جمع ہو گئے ہیں جو اس بات کے مقتضی ہیں کہ ایک صحت مند نظام حیات کو جلد از جلد قبول کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل

اسباب خصوصی طور سے ایک متوازن و مثبت نظام زندگی کو مقبول عام بنانے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔

۱ : مصنفین یورپ مثلاً جیمز اسٹورٹ مل اور لارڈ ملبورن کے زیر اثر یورپ اس زعم میں مبتلا تھا کہ ریاست (STATE) ایک انتظامی ادارہ ہے جسے لوگوں کی دینی و اخلاقی اور معاشی و معاشرتی اصلاح سے کوئی سروکار نہیں۔ آج یہ تصور حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے اور اسکی جگہ ایک نئے زاویۂ نگاہ نے لے لی ہے۔ آج کی ریاست ایک آفاق گیر شے ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، معیشت و معاشرت غرضیکہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو اس کی ہمہ گیری سے خارج نہیں۔ اب ریاست ایک مثبت ادارہ ہے جو انسانی زندگی کو مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اب منفی ریاست کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲ : یہ بات ایک مسلّم صداقت کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ بے دینی اور آزاد خیالی دور حاضر کے مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لادینیت کا سہارا لے کر ماضی کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ مذہب پسند طبقہ کو برا بھلا بھی کہا جا سکتا ہے مگر اسکا کیا علاج کہ لادینیت اور آزاد خیالی کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کرتی۔ اگر مذہب کو زندگی کے پروگرام سے خارج کر دیا جائے تو بھی لادینیت سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ یہ امر بھی ایک نظام حیات کو قبول کرنے کا متقاضی ہے۔

۳ : دور حاضر میں جمہوریت ایک بے کار چیز بن کر رہ گئی ہے جسکی حیثیت ایک خوشنما نعرہ سے زیادہ نہیں۔ جمہوریت صرف یہ بتاتی ہے کہ "وہ کرو جو عوام چاہیں" اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کیا چاہتے ہیں؟ اسکا کوئی واضح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے

کہ عوام کے پیش نظر کوئی مثبت نظریہ یا تعمیری پہلو سرے سے موجود ہی نہیں۔ دوسری طرف رائج الوقت فلسفے بھی کوئی مخصوص نظریۂ حیات پیش نہیں کر سکتے۔ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ فرد اور ریاست دونوں کے پیش نظر کوئی خاص نظریۂ زندگی ہو یہ ضرورت اتنی ہی ناگزیر و شدید ہے جتنا انسان کے لئے ہوا اور پانی۔ اس کے بغیر ریاست کا وجود و عدم برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفکرین بیسویں صدی کی ریاست کو نظریاتی ریاست کے نام سے پکارتے ہیں۔

۴: موجودہ دور کی حیرت انگیز سائنسی ایجادات نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ تیز رفتار وسائل حمل و نقل کی بدولت اب مہینوں کا سفر دنوں اور دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ جغرافیائی بُعد کے کم ہونے سے اب دور افتادہ ملکوں کے ڈانڈے باہم مل گئے ہیں۔ ذرائع نشر و اشاعت کی فراوانی، نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو مربوط کر دیا ہے۔ اب پوری دنیا ایک شہر اور پوری انسانیت ایک خاندان بنتی جا رہی ہے۔ مذکورہ بالا اسباب و ذرائع بہ بانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ اب انسانیت کثرت و تقسیم کے فلسفہ کو خیرباد کہہ کر وحدت کی وادی میں پناہ لے رہی ہے۔ دور حاضر قدیم مغرب کے قدیم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

موجودہ دور میں انسان کو ایک ایسے نظریۂ حیات کی ضرورت ہے جو پوری انسانیت کو ایک مضبوط و مستحکم رشتہ میں منسلک کر دے اور ان کے باہمی تنازعات و اختلافات کو ختم کر کے ان کی کثرت کو وحدت میں بدل دے۔ خدانخواستہ اگر یہ بات نہ ہو پائی تو اس امر کا خطرہ دامنگیر ہے کہ کثرت اور تقسیم پسندی کا فلسفہ انسان کی تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دے اور اس کے سامنے بقاء و ارتقاء کے سب راستے مسدود ہو جائیں۔

اسلام ـــ ایک مکمل نظامِ حیات

سوال ۵: اسلام دورِ حاضر کے مسائل حل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہے؟ دلائل کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب: اس میں شبہ نہیں کہ دینِ اسلام زندگی کے مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کرتا ہے اور دنیا کا کوئی نظریۂ حیات اس ضمن میں اسکا حریف نہیں بن سکتا۔ جو شخص بھی تعصب کی عینک اتار کر اسلامی نظامِ حیات کا مطالعہ کرے گا وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہوگا۔

اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جو ایک طرف زندگی کے مسائل کا منصفانہ حل پیش کرکے ہر طرح کی فکری الجھنیں دور کرتا ہے اور دوسری جانب تہذیبی اور تمدنی زندگی کے لئے ایک مفصل پروگرام دیتا ہے۔ اسلام کا پیش کردہ نظامِ زندگی اس قدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسکی وسعتوں سے خارج نہیں۔ اسلام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے مفصل ہدایات دیتا ہے۔ فرد ہو یا معاشرہ۔ سرمایہ دار ہو یا مزدور۔ کسان ہو یا زمیندار اسلام نے ہر ایک کے لئے بہترین ہدایات کا ذخیرہ باقی چھوڑا ہے اور ہر ایک کو خاص حدود کا پابند بنایا ہے۔ اسلام کا پیغام رنگ و نسل۔ ذات برادری اور جغرافیائی حدود و قیود سے آشنا نہیں۔ اسکی نگاہ میں محمود و ایاز کی کوئی تمیز نہیں۔ صہیب رومیؓ اور بلال حبشیؓ اسلام کی پناہ میں آکر وہ منصب و مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ابو جہل و ابولہب کو قریشی ہونے کے باوصف حاصل نہ ہو سکا۔

اسلام انسانی معاشرہ کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے لہذا اس کے لئے ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اسلام جسمانی زندگی کے پہلو بہ پہلو روحانی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ مادی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال

کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح مادی زندگی
سے بالکل ہی آنکھیں موند لی جائیں اور نہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مادی زندگی میں
منہمک ہو کر روحانی اقدار کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ دین اسلام دراصل انسان کو یہ بات
سکھانا چاہتا ہے کہ اس کائنات ارضی کی ہر چیز تیری خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے
اور تجھے صرف ان کے لئے خلق نہیں کیا گیا۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
(اقبال مرحوم)

زندگی کے بنیادی مسائل اور اُن کا حل

سوال ۹: انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کون سے ہیں اور ان کا حل کیوں ضروری ہے؟

جواب: "تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ انسان زندگی کے متعلق چند سوالات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر دور کے فلاسفر، علماء اور مصلحین نے اپنی اپنی دانست کے مطابق ان کا جواب دیا ہے۔ مذہب ان کا حل پیش کرتا ہے۔ فلسفہ ان کو زیر بحث لاتا ہے۔ تمدن ان کی بنیاد پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے جب تک یہ مسائل حل نہ ہوں نہ زندگی کا کوئی مسئلہ طے ہو سکتا ہے نہ تمدن کا نقشہ جم سکتا ہے۔ وہ اساسی مسائل یہ ہیں۔

۱: اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟
۲: کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟

۳ : اگر ہے تو وہ کس قسم کی زندگی ہے اور اس کے لئے ہمیں دنیوی زندگی میں کیا کچھ کرنا چاہیئے؟

۴ : کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

۵ : اس کائنات کو کون چلا رہا ہے اور وہ کن صفات کا حامل ہے؟

۶ : خالقِ کائنات اور بنی نوعِ انسان کا باہم کیا تعلق ہے؟

۷ : کیا اس کارگاہ حیات میں کوئی اخلاقی قانون بھی ہے؟ بصورت اثبات اسکی تفصیلات کیا ہیں؟

۸ : کائناتِ عالم میں انسان کا منصب کیا ہے؟

۹ : وہ خود مختار ہے یا مجبور محض؟ وہ کسی دوسری طاقت کے سامنے جوابدہ ہے یا نہیں؟

۱۰ : انسان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے؟

یہ بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی نظام حیات ایک لمحہ کے لیے بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہر تمدن خواہ کسقدر گھٹیا کیوں نہ ہو ان سوالات کا حل ضرور تلاش کرے گا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تمدن کے سب متعلقات ان مسائل سے وابستہ ہیں اور ان مسائل کو حل کئے بغیر تمدن کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تمدن کے سب شعبے اخلاق و معاملات۔ معیشت و معاشرت۔ سیاست و اجتماعیات علم و فلسفہ۔ سب ان کے زیر اثر ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ ان سوالات کا حل تلاش کرنا صرف اہل علم اور ارباب دانش کا حصہ بنے بلکہ عوام کے لئے بھی ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ازبس ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کئے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ موٹی سی بات ہے کہ جب تک زندگی اور موت کے

بارے میں کوئی نظریہ قائم نہ کیا جائے، انسانی افعال میں نظم وضبط کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ انسان بلاجبر واکراہ اپنی مرضی سے جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو اس کا مقصد یقیناً یا تو دنیوی فلاح ہوگا یا اخروی۔ ظاہر ہے کہ اخروی فلاح کو اسی صورت میں پیش نظر رکھا جاسکتا ہے جب انسان تصور آخرت کو جزو ایمان سمجھتا ہو۔

ان مسائل کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ان مسائل کا کچھ نہ کچھ جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ اسی جواب پر اسکی زندگی کے معاشرتی مسائل کا انحصار ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی قوم ایک خاص انداز سے ان مسائل کو حل کرتی ہو مگر عملی طور پر ان کا تمدن اس سے بالکل مختلف ہو۔ بخلاف ازیں اس قوم کے تمدن و معاشرت کی گاڑی ہمیشہ اسی راہ پر رواں دواں ہوگی جو ان کے نظریات وافکار سے متعین کی ہوگی۔

علم کے ذرائع

سوال نمبر ۱: وہ کون سے وسائل وذرائع ہیں جن کی مدد سے زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرسکتے ہیں؟ تفصیلاً لکھیے۔

جواب: ہم بنیادی مسائل کو حل کرنے میں ان وسائل و ذرائع کو کام میں لائیں گے جن سے تحصیل علم میں مدد لی جاتی ہے۔ ہم ان پر ترتیب وار روشنی ڈالتے ہیں

۱: **حواس خمسہ:** دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کی قوتوں کو عربی میں علی الترتیب باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ اور شامہ کہتے ہیں بحیثیت

مجموعی ان کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ ان قوتوں کے ذریعے سے ہمیں محسوسات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں۔ تاہم ان کے ذریعہ صرف محسوسات کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غیر محسوسات کا ادراک ان سے ممکن نہیں۔ خلاصہ یہ کہ حواس سے صرف مادی اشیاء کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بنیادی مسائل موضوع بحث ہیں وہ سب مابعد الطبیعیاتی (MATAPHYSICAL) ہیں۔ بنابریں ان کے حل میں حواس خمسہ سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

۲: عقل: تحصیل علم کا دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عقل انسان و حیوان کے مابین وجہ امتیاز اور بنی نوع آدم کی عظیم خصوصیت ہے۔ تاہم عقل زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عقل محسوسات و مشاہدات کے بغیر تنہا حصول علم کے لئے کافی نہیں۔ علوم عقلیہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ان کی بنیاد معمولی قسم کے محسوسات اور سطحی معلومات پر رکھی گئی ہے۔ جہاں حواس کام نہیں کرتے وہاں عقل بھی بے بس نظر آتی ہے۔ جب مذکورہ صدر مسائل حواس کے دائرہ سے خارج ٹھہرے تو وہ یقیناً عقل کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتے۔

؎ نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

(اقبالؒ)

عقل کی اس کوتاہ دامنی کے باوصف انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ اس سلسلہ میں "فلسفہ" عالم وجود میں آیا۔ فلسفہ کسی نوع کا بھی ہو وہ اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے

بارے میں عقل کا صریح فیصلہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہ ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ مگر مقام حیرت ہے کہ ہر فلسفہ نے ایسے دقیق مسئلہ کو عام محسوسات کے دائرہ میں داخل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی فلسفہ اور علم کلام کے ماہرین ان مسائل میں گمراہ ہو گئے۔

۴: وجدان: وجدان عربی زبان میں پالینے یا حاصل کرنے کو کہتے ہیں اصطلاحاً وجدان حواس خمسہ اور عقل کے علاوہ ایک ایسا ذریعۂ علم ہے جو تزکیہ نفس یعنی ترک دنیا، نفس کشی اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم بلا واسطہ عطیۂ الٰہی کے طور پر ملتا ہے البتہ ریاضت و نفس کشی اس کے حصول میں معاون ہوتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ انسان اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرکے کچھ ایسی معلومات حاصل کرے جو حواس کے ذریعہ ممکن نہیں مگر یہ معلومات کسی طرح بھی یقینی، مشکوک اور شبہات سے پاک نہیں ہو سکتیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اشراقی فلاسفہ جو اس ذریعۂ علم پر ایمان رکھتے ہیں عالم آخرت کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ اگر اشراق کے ذریعہ حاصل کردہ علم یقینی ہوتا تو اس مسئلہ میں ان کے یہاں کبھی اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں اگر اس ذریعہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے مسائل زیر بحث کے حل کرنے میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ اہل کشف کا دعویٰ ہے کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں۔ گویا بنیادی سوالات کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کے حامل کوئی مثبت نظام حیات پیش نہیں کر سکے۔

۴ : وحی : وحی اس علم کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے عطا کرتا ہے۔ انبیاء و رسل خدا کے اس علم کو بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ وحی کی تین خصوصیتیں ہیں جو اس کو علم کے دیگر ذرائع سے ممتاز کرتی ہیں۔

پہلی خصوصیت : وحی کے ذریعہ وہ علم حاصل ہوتا ہے جو حواس خمسہ کی مدد سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی مابعد الطبیعیاتی مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جب کہ حواس خمسہ سے صرف مادی محسوسات کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے

دوسری خصوصیت : اس علم کا ذریعہ دوسرے ذرائع سے جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس میں حواس خمسہ اور منطقی استدلال سے بالکل کام نہیں لیا جاتا نبی جب پیش آمدہ حقائق کو اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرتا ہے تو اس کے نزدیک یہ حقائق محسوسات سے بھی زیادہ یقینی وقطعی ہوتے ہیں۔

تیسری خصوصیت : وحی کے ذریعہ حاصل شدہ علم اشراقی علوم کی طرح عملی زندگی سے لاتعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی زندگی کی شرح و تفصیل ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک ٹھوس نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔

سوال ۱۱ : علم کے مختلف ذرائع میں سے آپ کے نزدیک کونسا ذریعہ زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور کیوں؟

جواب : مندرجہ ذیل وجوہ و اسباب کی بنا پر ان چاروں ذرائع میں سے وحی ہمارے نزدیک زیادہ قطعی و حتمی علم کی حامل ہے

اور وحی نظامِ زندگی سے بحث کرتی اور زندگی کا عملی پروگرام پیش کرتی ہے لہٰذا وحی کا پیش کردہ علم ہی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے۔ تاریخ اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ الہامی علوم بعض معاشروں کے نظامِ زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

۲: جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بنی نوع انسان کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا ہے تو انسان کے لئے روحانی رہنمائی مہیا کرنا اس کی رحمت سے کچھ بعید نہیں۔ چنانچہ وحی اسی روحانی تشنگی کا ازالہ کرتی ہے۔ یہ وصف علم کے دیگر ذرائع میں موجود نہیں۔

۳: وحی کے ذریعہ قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے جب کہ دیگر ذرائع سے حاصل کردہ علم مشکوک و مشتبہ ہوتا ہے۔

۴: وحی سے حاصل شدہ علم اختلاف و تضاد سے پاک ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے عقلی علوم میں کثیر اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کے نظریات ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔

سوال ۱۲: وحی کی صداقت و حقانیت کن دلائل سے ثابت ہے؟ تفصیلاً بیان کیجئے۔

جواب: جب یہ بات دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ وحی عقل کے عین مطابق ہے اور ان دونوں کے مابین کوئی تضاد نہیں پایا جاتا تو ایک دانشمند آدمی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ وحی سے ثابت شدہ حقائق کو جاننے پر کمر کسے اور اگر

وہ صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان سے آتے۔ کسی آدمی کے قول کو جانچنے کے لئے ہمارے پاس دو معیار ہیں۔

۱: قائل کی شخصیت کو جانچا جائے۔

۲: قول کے معنی و مفہوم پر غور کیا جائے گے۔

جہاں تک پہلے معیار کا تعلق ہے سب انبیائے کرام صادق القول اور راستباز ہیں۔ خدا کے پیغام کو پہنچانے میں انہوں نے کبھی تساہل و تغافل سے کام نہیں لیا۔ بنا بریں وحی کا جو پیغام انہوں نے ہم تک پہنچایا وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک اور ہر لحاظ سے یقین و اعتماد کے لائق ہے۔

صداقتِ اقوال کا پہلا معیار: باقی رہا دوسرا معیار تو اس ضمن میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے ہاتھی کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے تو اسکی یہ بات قابل تسلیم نہیں۔

انبیاءؑ کے اقوال اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فرمودات یا تو مابعد الطبیعات سے متعلق ہونے کی بنا پر تجربہ و مشاہدہ کے دائرہ سے باہر ہیں، یا عقل و قیاس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی تاریخ اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ کسی نبی نے کوئی بات خلاف عقل نہیں کی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بنی نوع انسان اس کی کوئی بات سمجھ نہ سکیں۔

صداقتِ اقوال کا دوسرا معیار: قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ وہ تناقض و تضاد سے پاک ہو۔ انبیائے کرام کے ارشادات ہمیشہ تضاد کے عیب سے پاک رہے ہیں۔ حضرات انبیاءؑ سب کے سب دین اسلام کے مبلغ ہیں اور ان کے اقوال سرچشمہ وحی سے مستفاد ہیں۔ بنا بریں ان کے اقوال میں فروعی قسم کا فرق

وامتیاز ہو سکتا ہے لیکن اصول میں کوئی فرق نہیں۔

صداقت اقوال کا تیسرا معیار: اقوال کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں۔ ظاہر ہے کہ انبیاءؑ کی تعلیمات سے ہمیشہ مفید نتائج برآمد ہوئے اور انسانیت عدل وانصاف اور خوشحالی وفارغ البالی کی نعمتوں سے مالا مال ہوئی۔

اقوال کے ناقابل اعتماد ہونے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ قائل جھوٹا اور بدکردار ہوتا ہے۔ ایسا شخص یا تو دانستہ جھوٹ گھڑ لیتا ہے یا صحیح قول کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ مگر انبیاءؑ کا دامن اس سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دشمن بھی ان کو بلند کردار اور صادق القول تسلیم کرتے ہیں۔ بعض اوقات نادانستہ طور پر بھی قول میں غلطی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قول کا ناقل سلیم العقل نہیں ہوتا۔ یا حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے اصل بات بھی بھول جاتا ہے۔ انبیاءؑ بالاتفاق اس کمزوری سے بھی پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی اشخاص کو نبی منتخب کرتا ہے جو سلیم المزاج، سنجیدہ اور صائب الرائے ہوں۔

غیر شعوری طور پر قول میں غلطی واقع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ فنی علوم کے زیر اثر اس کے مفہوم میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ انبیاءؑ اس غلطی سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فنی اور ادبی علوم سے یکسر بے گانہ ہوتے ہیں یہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ان کی تعلیمات دوسروں کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی غیر معمولی ذریعہ سے ان پر نازل ہوتی ہیں اور کسی تبدیلی کے بغیر ہی نوع انسان تک پہنچا دی جاتی ہیں۔

سوال ۱۳: حسی تمدن سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً لکھئے۔

جواب: انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا اصل اور واقعی حل وہی ہے جو انبیائے کرام نے پیش کیا۔ حسی تمدن کی بنیاد محسوسات پر رکھی جاتی ہے وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بری طرح ناکام رہتا ہے۔ ایسے تمدن کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱: اس تمدن کی بنیاد ان ظاہری اشیاء پر رکھی جاتی ہے جن کو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حواس سے چونکہ صرف مادی اشیاء کا ادراک کیا جا سکتا ہے اس لئے حسی تمدن صرف انہی اشیاء کا قائل ہے جو حواس سے محسوس کی جاتی ہوں۔ جو امور حواس کی گرفت سے باہر ہوں وہ اس کے نزدیک صرف وہمی اور فرضی ہیں۔ چونکہ یہ تمدن انسانی خواہشات کو سب سے زیادہ پورا کرنے والا ہے اس لئے یہ دنیا کا مقبول ترین تمدن ہے۔ امریکہ کے ماہر عمرانیات پروفیسر سوروکن نے ایسے تمدن کا نام (SENSATE CULTURE) تجویز کیا ہے۔ عرف عام میں ایسے تمدن کو مادی تمدن (MATERIALISTIC CULTURE) کہتے ہیں۔

۲: یہ تمدن محسوسات کی دنیا سے آگے بڑھ کر کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ میں غیر مادی خدا اور موت و حیات کوئی چیز نہیں۔

۳: اس تمدن کو تسلیم کرنے والا لازمی طور سے آزاد خیال مذہب سے متنفر اور خود غرض ہوگا۔

۴: اس تمدن پر ایمان لانے والے اخلاقی حدود کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک ہر وہ بات جائز اور درست ہے۔ جس میں ان کا ذاتی نفع مضمر ہو اور ہر وہ عمل روا ہے جس سے جسمانی آرام اور خوشی حاصل ہو۔

۵: حسی تمدن پر ایمان لانے والے حاضر نفع کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے لئے

انہیں جو کچھ بھی کرنا پڑے بے دریغ کر ڈالتے ہیں۔ وہ سوا ایک رخ دیکھ سکتے ہیں۔ نفع اندوزی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی جرأت، ایثار اور صبر کے الفاظ سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔

۶: جس معاشرہ میں حسی تمدن کا دور دورہ ہو وہ اخلاق عالیہ سے یکسر عاری اور انواع و اقسام کے مظالم سے لبریز ہوتا ہے۔ اس میں لوگ مختلف اخلاقی نقائص میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کم تولنے لگتے ہیں یا شہوت رانی کے لئے من مانے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔

۷: حسی تمدن کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس میں سینما، کلب، ناچ گھر، شراب خانے اور قمار خانے عام طور سے پائے جاتے ہیں۔ یہ ادارے اگرچہ انسانیت کے لئے حد ضرر رساں اور شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں مگر حسی تمدن میں ان کو سماجی تہواروں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۸: جب کسی قوم میں اجتماعی شعور کی بہتات ہو تو اس میں انفرادی مفاد پرستی اجتماعی نفع اندوزی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ قوم و ملک کی عظمت کے نام پر انسانی خون کی ارزانی اور ہر طرح کے ظلم و تعدی کو نہ صرف جائز بلکہ حب الوطنی کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عرب قبائل اسی غلط فہمی کا شکار رہتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ اس نام نہاد روشنی کے دور میں حسی تمدن کے علمبرداروں نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۸ء کی دو جنگوں میں جس قدر انسانی خون بہا چکے ہیں اتنا خون انسانی تاریخ کی مجموعی جنگوں میں بھی نہیں بہایا گیا۔ مقام حیرت ہے کہ انسان کشی کے یہ سب مظاہر حسی تمدن کی نگاہ میں لائق تحسین ہیں موجب نفرت نہیں۔

سوال ۱۲: عقلی تمدن سے کیا مراد ہے؟ اس کے محاسن و معائب پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔

جواب: انسانیت کی تاریخ میں کوئی ایسا تمدن نہیں ملتا جو خالص عقل کی بنا پر استوار کیا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جو کام انجام دیتا ہے ضروری نہیں کہ وہ عقل کی روشنی میں تکمیل پذیر ہوتے ہوں بلکہ انسان کے اکثر کاموں میں جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ جذبات انسان میں عمل کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فعل وقوع پذیر ہوتا ہے۔

کوئی تمدن خالص عقلی نہیں ہوتا۔ جو تمدن عقلی کہلاتے ہیں دراصل وہ بھی اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے مادی ہوتے ہیں۔ ان کو عقلی تمدن صرف ظاہری اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ فلسفہ جو سراسر عقل پر مبنی ہوتا ہے بعض اوقات عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو جیسے یونانی فلاسفر جو عقل کے علم بردار تھے یونان کی بعض وہمی باتوں کو حقیقت سمجھنے لگے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ تمدن میں جو جذباتی یا وہمی اجزاء پائے جاتے ہیں عقل ان پر کڑی تنقید نہیں کرتی بلکہ خود ان کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ جذباتی اجزائے تمدن عملی طور پر غالب نظر آتے ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ یونان کے تفریحی مشاغل میں یہ بات شامل تھی کہ انسانوں کو درندوں سے پھڑوایا جاتا اور تماشائی اس دلدوز منظر سے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے۔ ہندوستان میں ستی کی قبیح رسم عرصہ دراز تک موجود رہی۔ ظہور اسلام سے قبل عربوں میں دختر کشی عام طور سے رائج تھی۔

مقام حیرت ہے کہ ان ممالک کے مدعیانِ عقل نے ان مظالم کا سدباب کرنے

گے بجائے ان کے جواز میں عقلی گھوڑے دوڑا نے شروع کئے اور طرح طرح کی تاویلیں کر کے ان کا عقلی جواز ثابت کیا حالانکہ دنیا کا کوئی عقلمند انسان ان انسانیت کش مظالم کو قرینِ عقل و قیاس قرار نہیں دیتا۔

یورپ کے موجودہ تمدّن کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور اسے علمی و عقلی تمدّن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ تمدّن علم و عقل سے یکسر عاری اور سراسر مادی تمدّن ہے۔ یورپی تمدّن کی کل کائنات مادی خواہشات کی تکمیل ہے اور بس۔

سوال ۱۵: اشراقی تمدّن پر روشنی ڈالئے اور اسکی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

جواب: اشراقی تمدّن سے وہ تمدن مراد ہے جس میں دنیوی لذّات کو یکسر نظر انداز کر کے تجرّد اور ترکِ دنیا کا شیوہ اختیار کیا جائے۔ یہ تمدّن مادی تمدّن کی ضد ہے جسطرح مادی تمدّن میں روح اور اس کے متعلقات کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا اسی طرح اشراقی تمدّن میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ لڑی جاتی ہے۔ اس تمدن کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ انسانی جسم ایک قید خانہ ہے جس میں روح کو محبوس و مقید کر دیا گیا ہے۔ جب تک روح اس قفس سے آزاد نہیں ہو جاتی طائرِ روح ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ روح اپنے اصلی مرکز سے اسی صورت میں متصل ہو سکتی ہے جب اس قفسِ عنصری سے چھٹکارا حاصل کرے یا یہ قید خانہ اس حد تک کمزور ہو جائے کہ روح جب چاہے اس کی قید سے آزاد ہو کر اپنے مرکز کی طرف پرواز کر سکے۔ اشراقی تمدّن کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:-

۱ : یہ تمدن جسم کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔

۲ : یہ تمدن مادیت کا دشمن ہے۔

۳ : اس تمدن میں اہلی زندگی کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تجرد و رہبانیت کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

۴ : یہ تمدن عورت کو لعنت قرار دیتا ہے۔

۵ : روحانی کمال حاصل کرنے کے لئے اس تمدن میں طرح طرح کی جان توڑ ریاضتیں کی جاتی ہیں۔

۶ : شہری زندگی پر ویرانوں اور بیابانوں کی سکونت کو ترجیح دینا ان کا خاص نظریہ ہے۔

ایسے تمدن کی تابندہ مثال دورِ وسطی کا مسیحی یورپ ہے۔ اس دور میں عیسائیت پادریوں کی غلط رہنمائی کے باعث اشرافیت کے بجائے جوگیانہ اور غیر فطری نظام بن گئی۔ مشہور مورخ لیکی (LECKY) نے اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ (HISTORY OF WESTERN MORALS) میں عیسائیوں کی غیر فطری ریاضتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱ : جہاں جہاں عیسائیت کا اثر در سوخ بڑھا وہاں تمدن کی بنیادیں ہل گئیں

۲ : ملک کی آبادی میں بڑی تیزی سے کمی ہوتی چلی گئی

۳ : امراض واموات کا دورہ دورہ ہوا

۴ : یورپ کے رہنے والے مفلسی کا شکار ہو گئے

۵ : علم نے رخت سفر باندھا اور جہالت کا سکہ جاری ہوا

۶ : شہریت کے آثار مٹ گئے وسائل حیات میں کمی آگئی

۷ : پوری مسیحی دنیا جہالت و وحشت اور تاریکی کی لپیٹ میں آگئی

یہی وجوہ و اسباب تھے جن کی بنا پر قرون وسطیٰ کو قرون مظلمہ (DARK AGES) کہا جانے لگا۔

سوال ۱۶: اسلامی تمدن کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ تفصیلاً لکھیے

جواب: انبیائے عظام نے وحی الٰہی کی روشنی میں جو نظریۂ زندگی پیش کیا ہے اسے اسلامی تمدن کہا جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محض حواس عقل یا اشراق کی مدد سے ایک صحت مند معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ بتانا باقی ہے کہ وحی و الہام کے ذریعہ ایسے معاشرہ کا قیام کیوں کر ممکن ہے جس میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ انبیائے کرام زندگی کے بنیادی مسائل کا جو حل پیش کرتے ہیں اسلامی معاشرہ اس پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا اسلامی تمدن کے مطالعہ سے پہلے یہ دیکھنا ناگزیر ہے کہ انبیائے کرام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو کس طرح حل کیا۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ حل حسب ذیل ہے۔

۱: انسان اور اسکی زندگی

انسان اور اسکی زندگی کے بارے میں انبیائے کرام نے چار نکات پیش کئے ہیں

اوّل: انسان خدا کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دوئم: وہ اشرف المخلوقات ہے اور تمام مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے

سوئم: انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ زندگی کے تمام امور میں خدا کی دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو۔

چہارم: موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

۲ : کائنات کی حقیقت

کائنات سے متعلق قرآن کریم میں تین باتیں واضح کی گئیں ہیں۔

اول : ہر چیز خدا کی پیدا کردہ ہے۔

دوئم : اس کائنات کا نظام خدا کے قانون (سُنۃُ اللّٰہ) کے مطابق چل رہا ہے۔

سوئم : یہ دنیا انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس طرح انسان کے لئے ایک آزمائش گاہ ہے۔

۳ : اللّٰہ اور اسکی صفات

قرآن کریم میں صفات الٰہی کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱ : خداوند کریم اس کائناتِ ارضی کا واحد خالق و مالک اور مُدبّر ہے۔

۲ : وہ جسم اور اس کے لوازمات سے پاک ہے۔

۳ : وہ بے مثال ہے۔ حواس کے ذریعہ اسکا ادراک ممکن نہیں۔

۴ : وہ رحیم اور عادل ہے اسکی صفتِ عدل کا تقاضا ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ انسانوں پر راہ ہدایت واضح کرتا ہے۔ اسی بنا پر وہ روزِ قیامت اچھے اور بُرے اعمال کی جزا یا سزا دے گا۔

سوال ۱۷ : اسلامی تمدن کے اجزائے ترکیبی انفرادی اعتبار سے انسان پر کیا اثر ڈالتے ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : اسلامی تمدن انسانی قلب و ذہن کی جو کایا پلٹ کرتا ہے اس کی بڑی بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱ : اسلامی تمدن کے عناصر ترکیبی سب سے پہلے انسان میں اس تصور کو جنم دیتے

ہیں کہ یہ عالم ارضی نہ تو ایسی سلطنت ہے جسکا کوئی حاکم نہ ہو اور نہ ہی چند بادشاہوں کی مشترکہ جاگیر ہے۔ بلکہ اسکا ایک ہی مالک ہے جو اسکا خالق بھی ہے۔ اور حاکم بھی اس نظریہ کے ذہن میں راسخ ہو جانے سے اقوام و قبائل کی تقسیم سطحی معلوم ہونے لگتی ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ انسانیت ایک وحدت ہے۔

۲ : تصور آخرت کے ذہن میں پختہ ہونے سے اصلاح عمل کا جذبہ ابھرتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ انسان لغو قسم کی تفریحات سے کترانے لگتا ہے۔

۳ : انسان میں احساس ذمہ داری کا جذبہ کروٹ لیتا ہے۔

۴ : ظلم و تقوی اور ایذا رسانی سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

۵ : جب انسان اپنے آپ کو خدا کی زمین میں اسکا نائب و خلیفہ تصور کرنے لگتا ہے تو اس سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخلوقِ خدا کا حاکم نہیں بلکہ خادم ہے۔ وہ ہر لحظہ خائف رہتا ہے کہ اس سے کہیں ظلم و تعدی کا صدور نہ ہو جائے اس پر بس ہر وقت قیام عدل و انصاف کی دھن سوار رہتی ہے۔

۶ : اسلامی تمدن میں نہ مادی تمدن کی سی خود غرضی اور مطلب برآری ہوتی ہے نہ اشراقی تمدن کا جوگیا پن اور ترک دنیا۔

۷ : اسلامی تمدن مصلحت شناسی اور زمانہ سازی کا قائل نہیں کہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلا جائے بلکہ اسکی تعلیم یہ ہے: ـــ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

۸ : ترک دنیا اسلام کی نگاہ میں اسی طرح قابل مذمت ہے جیسے دنیوی مشاغل میں ڈوب جانا اور دینی امور سے اغماض برتنا۔ اسلام کی تعلیم ہے

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

اسلام میں ترک دنیا نہیں ہے

اسلامی تمدن نے انسانی قلب و ذہن کی جو کایا پلٹ کی اس کا واضح ثبوت ہم کو
قرونِ اولیٰ میں ہی مل سکتا ہے۔ خلافتِ راشدہ اسلامی تمدن کی بہترین مثال
ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ خود موٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا
کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو دریافت فرماتے کیا سب مسلمانوں کو یہ
کھانا میسر آ سکتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو کھانا قبول نہ کرتے۔

عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا یہ عالم تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی
تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی شخص ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل
کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔ یہ ہے اسلامی تمدن کے اخلاص، عدل و تقویٰ کی
روشن ترین مثالیں۔

مذکورہ بالا بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ زندگی کے بنیادی مسائل
کا صحیح حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعے ممکن ہے۔ جس تمدن کی عمارت مذکورہ بالا
اصول و احکام پر استوار کی جائے گی وہ تمدن صحیح و بہترین اور مستحکم ہو گا۔

مذہب کی ضرورت

سوال ۱۸: مذہب کی ضرورت و اہمیت دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے۔

جواب: مذہب کی ضرورت انسانی تاریخ کے ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ یہ درست
ہے کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے مختلف مذاہب اختیار کئے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانوں
نے مذہب کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ مذہب
کا جذبہ انسان میں فطری اور ازلی ہے۔ عرب میں بعض لوگ ذات خداوندی کے منکر تھے۔ اس
کے باوصف جب وہ حوادث و آلام میں گرفتار ہوتے یا بحری جہاز میں سوار ہوتے اور طوفان
باد و باراں میں گھر جاتے اور ہلاکت جان کے لالے پڑ جاتے تو وہ بھی خدائے حقیقی کو پکارنے لگتے

مذہب ایک طرف انسان کو اس کی درماندگی و بے چارگی سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کو ایک ایسی ہستی کے تصور سے روشناس کرتا ہے جو لامحدود ہے اس سے انسان میں یہ احساس کروٹ لیتا ہے کہ وہ ایسی ذات بے پایاں کے سامنے سر نیاز جھکا دے اور اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کو اپنا شیوہ بنائے۔

خلاصہ یہ کہ مذہب دیگر انسانی جذبات کی طرح ایک جذبہ ہے۔ دانستہ یا نادانستہ، بخوشی یا مجبوراً کسی مذہب کو تسلیم کرنے کے لئے انسان مجبور ہے۔ بعض لوگ بظاہر مذہب کے منکر ہوتے ہیں مگر بعض چیزوں کو مافوق الفطرت مانتے ہیں۔ گویا وہ اس چیز کو وہی درجہ دیتے ہیں جو مذہب خدا کو دیتا ہے۔ اس طرح وہ لامذہب ہونے کے مدعی کہلانے کے باوجود غیر شعوری طور پر ایک مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں

مذہب کا جذبہ انسان میں پیدائشی ہے۔ انسان جب اپنے گرد و پیش پر غور و فکر کرتا ہے تو بڑی آسانی سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ کائنات عالم کا یہ طویل و عریض سلسلہ کسی خالق و مالک کے بغیر عالم وجود میں نہیں آیا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ کارخانۂ قدرت خود بخود قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اپنی بقا کے لئے کسی کا محتاج ہے۔ اسی انداز فکر سے انسان میں مذہب کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ فلسفہ بھی اسی کی پیداوار ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس کائنات ارضی پر جن ان گنت اور غیر محدود نعمتوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے ان کو دیکھ کر ایک حد درجہ ناشکرا انسان بھی حمد باری کے ترانے الاپنے لگتا ہے اور اس کے جسم کا ہر رگ و ریشہ مجسم حمد بن جاتا ہے۔ تشکر و امتنان کا یہی جذبہ مذہب کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ ایک منکر خدا جب پکار اٹھتا ہے کہ "ہم کو کیا ہی اچھی نعمتیں ملی ہیں!" تو غیر شعوری طور پر وہ نہ صرف خدا کا قائل ہو جاتا ہے بلکہ اپنا تعلق اپنے رب سے استوار کر لیتا ہے۔

مذہب اور دوسرے جذبات میں فرق و امتیاز

اس میں شبہ نہیں کہ مذہب ایک جذبہ ہے۔ مگر اس میں اور دیگر جذبات میں گہرا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اگر مذہب ایک فرضی جذبہ کا نام ہوتا تو اسلام اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ اس لئے کہ کوئی مذہب اس جذبہ سے خالی نہیں۔ در اصل بات یہ ہے کہ مذہب ایک حقیقی جذبہ ہے۔ جس طرح خالق کائنات نے انسان کے تمام جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے اسی طرح اس نے مذہبی جذبہ کی تسکین کا اہتمام بھی کیا ہے۔ قرآن کریم اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں انبیائے کرام آ کر انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے رہے ہیں۔ اس کائناتِ ارضی پر انبیائے کرام کی تشریف آوری اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ انسان طلبِ حق کے لئے کس قدر بیتاب ہے۔ انبیاء کی آمد اسی طلب صادق کا جواب ہے۔ خلاقِ عالم نے بنی نوع انسان کی شدید ضرورت کے پیش نظر حضرات انبیاء کو مبعوث کیا۔ اگر اس خاکدانِ ارضی پر انبیاء کی تشریف آوری نہ ہوتی تو بنی آدم زیور آدمیت سے عاری رہتے۔ پیغمبروں نے انسان کو شرفِ انسانیت بخشا۔ اس کی ہستی کی تکمیل کی اور اسے اس کا مذہب عطا کیا۔

مذکورۃ الصدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ انسان میں طلبِ حق کا جو جذبہ موجود تھا اس کی تسکین کے لئے خداوند عالم نے انبیائے عظام کے ذریعہ جو ہدایت بھیجی اسی کا نام مذہب ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انسان میں ایک ایسی ہستی کا شعور جنم لیتا ہے جو اس کو قوانین حیات دیتی ہے یہ ایسے قوانین ہیں جو فہم انسانی کو اپیل کرتے ہیں اور ان سے مفید نتائج برآمد

ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف ان قوانین کا نام ہی مذہب ہے۔ بخلاف ازیں مذہب انسان کو ایک ہمہ گیر زاویۂ نگاہ بھی دیتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کائنات ارضی کی ہر چھوٹی بڑی چیز انسان کے لئے مظہر ربوبیت بن جاتی ہے اور وہ ہر چیز میں خداوندی جلالی و جمالی کا نظارہ کرنے لگتا ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کائنات عالم کی کوئی چیز یونہی از خود معرض وجود میں نہیں آگئی بلکہ اس کا کوئی خالق و صانع ضرور ہے۔

اس نقطۂ نگاہ کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ہو مثلاً سیاست و معاشرت ہو یا معیشت۔ صلح و جنگ ہو یا الفت و عداوت ان تمام شعبہ ہائے حیات پر اسی نظریہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔

سوال :- ۱۹ - جب تاریخ کے ہر دور میں منکرین مذہب موجود رہے ہیں تو یہ بات کیونکر صحیح ہے کہ مذہبی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے؟

جواب :- یہ درست ہے کہ کوئی زمانہ منکرین مذہب کے وجود سے خالی نہیں رہا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب ایک فطری جذبہ نہیں - ہر قانون میں کچھ نہ کچھ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً قوت گویائی سے بہرہ ور ہونا انسان کی صفت لازمہ ہے مگر بعض انسان پیدائشی گونگے ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ خاندان میں بعض اشخاص جاہل مطلق ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پوری قوم میں ایک خاص جذبہ کا فقدان ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض آدمی مذہبی جذبہ کے حامل نہیں ہوتے۔

جس طرح ماحول سے متاثر ہو کر بعض آدمی اپنی قوت فکر یا خداداد فکری قوتوں
کو زائل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات مادی تعلیم کی کثرت یا روحانی
تاریکی اور جہالت کی وجہ سے مذہبی جذبہ مردہ ہو جاتا ہے اور سادہ فضا الحاد
کے مسموم اثرات سے متاثر ہو جاتی ہے مگر یہ سب اثرات لا مذہب ماحول کا
نتیجہ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کے فطری جذبہ ہونے سے انکار کر دیا
جائے اور کہا جائے کہ مذہب ایک غیر فطری اور اکتسابی وصف ہے۔

مشہور برطانوی فلسفی جیمز اسٹوارٹ مل نے یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی
چوٹی کا زور لگایا کہ مذہب ایک فطری جذبہ نہیں ہے مگر آخر کار وہ خود بھی مذہب
کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اس نے مذہب انسانیت (RELIGION OF HUMANITY)
کے نام سے ایک نیا فرقہ بنایا جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی بجائے نوع انسانی
کی ہمدردی کو مقصد اعلیٰ قرار دیا۔ اس طرح فلسفی مذکور نے غیر شعوری طور پر
ایک مذہب اختیار کر لیا۔

آگسٹ کومٹ کا زاویۂ نگاہ

انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی فلسفی آگسٹ کومٹ (AUGUST
COMTE) نے کہا تھا کہ موجودہ سائنسی دور نے مذہبی رجحانات کو
ختم کر دیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ مذہب انسانی فکر کی ابتدائی منزل ہے۔
دوسری منزل فلسفہ اور تیسری سائنس ہے مگر تاریخی حقائق فلسفی مذکور کے
قول کی تردید کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مذہب
سے فرار اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم مذہبی جذبہ کو کلیتہً مٹایا
نہ جا سکا۔ اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس دور میں مذہب بھی زندہ رہا۔
دو عظیم جنگوں کے بعد یورپ اور امریکہ میں مذہبی رجحانات میں کافی اضافہ

ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں مذہبی لٹریچر دنیا بھر میں ادب کی دیگر اقسام کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیدا ہو رہا ہے۔ ماضی قریب میں لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کے نام سے جو مظالم ڈھائے گئے ہیں اب ان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ دنیا بھر میں صرف روس ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہب کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مگر اب وہاں بھی مذہب کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ منکرین مذہب کسی قوی دلیل سے مذہب کا بطلان ثابت نہیں کر سکے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا موجود نہیں بلکہ وہ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ذاتِ خداوندی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اہل یورپ نے مذہب کے خلاف جو جدید فلسفہ ایجاد کیا تھا حق یہ ہے کہ وہ مذہب کی تردید نہ کر سکا۔ دورِ حاضر کے فلاسفہ تو مذہب کی ضرورت اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیئے دلائل بھی دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید منکرین مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں۔

فلسفۂ مادیت

سوال ۲۰ :- فلسفۂ مادیت کی توضیح کیجئے اور بتائیے کہ اس کو تسلیم کرنے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

جواب :- فلسفۂ مادیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے نزدیک اس کائنات کی ہر چیز مادہ کی پیداوار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جب ہم مادہ (MATTER) کے جواہر کی حقیقت اور ان کی حرکت کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے تو اس دنیا کے تمام اسرار ہم پر واضح ہو جائیں گے۔ طبیعاتی سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حرارت، روشنی، بجلی اور مقناطیس سب ایک ہی قوت کی مختلف صورتیں ہیں جو بذاتِ خود یا کسی چیز کے واسطہ سے ایک دوسری میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی کے بارے میں سائنس دان اگرچہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے تاہم اس بات کا امکان ہے کہ حیاتِ انسانی بھی ایک قسم کا کیمیائی یا طبیعاتی عمل ہو۔ ایک سائنس دان کے قول کے مطابق وہ مشترک قوت جو تمام کائنات میں کارفرما ہے اور جس کے نتیجے میں روشنی، حرارت اور بجلی وغیرہ وجود میں آتی ہے کچھ بعید نہیں کہ وہی قوت خود زندگی میں بھی کارفرما ہو۔ اگر زندگی کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے تو وہ محض ایک مادی چیز بن جائے گی۔ اور اس کے بارے میں مذہب کے سارے نظریات بے کار ثابت ہوں گے۔

سائنس دان ابھی تک یہ فتویٰ صادر نہیں کر سکے کہ انسانی فہم و شعور بھی مادی اور کیمیائی شے ہے۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ ہر ذہنی عمل اور ہر جذبہ و احساس کسی نہ کسی طرح ایک طبعیاتی عمل سے ضرور متعلق ہے۔ اسی طرح انسانی ذہن و شعور کی

ہر تبدیلی انسان کے طبعیاتی اور مادی نظام کی تبدیلیوں سے لازمی طور پر منسلک ہے
اس لئے عین ممکن ہے کہ انسانی جذبات و احساسات کو بھی مادی قدرات اور جواہر
ہی کی ایک تبدیل شدہ صورت قرار دیا جائے۔

چونکہ اکثر افراد سائنس سے مرعوب ہیں اس لئے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس نظریہ کو
تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ مذہب، اخلاق
اور تصورِ آخرت سے منکر ہو جائیں گے۔ مادی فلسفہ کی قبولیت کا یہ نتیجہ ہے کہ
دورِ حاضر میں اکثر لوگ مذہبی و اخلاقی اقدار کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔

سوال نمبر ۲۱:۔ علمی دلائل سے فلسفۂ مادیت کا ابطال کیجئے

جواب:۔ فلسفۂ مادیت انسانی ذہن و شعور کو مادی عمل میں تبدیل
کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ فلسفہ اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ جس طرح میکانکی
قوت کو کیمیائی قوت میں تبدیل کرنا ممکن ہے اسی طرح کیمیائی اور میکانکی قوتوں کو
حیاتی قوت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ تصور ایک بنیادی غلطی پر مبنی ہے۔ یہ تصور
اپنی ابتداء مادہ سے کرتا ہے۔ اور ذہن کو مادے کا ایک عمل قرار دیتا ہے۔ لیکن
درحقیقت یہ ذہن کو پہلے ہی قدم پر تسلیم کر لیتا ہے۔ جب کوئی انسان مادے کی
حقیقت کو تسلیم کرتا ہے تو یہ اس کا ایک ذہنی عمل ہے۔ یہاں تک کہ ذہن سے
انکار بھی ایک ذہنی عمل ہے۔ اس طرح اس کے انکار ہی میں اس کا اقرار شامل ہے
یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ذہن سے آزاد بھی ایک مادی دنیا موجود
ہے۔ اس دنیا کا کوئی نہ کوئی تعلق ذہن سے ہونا لازمی ہے۔ ہم جس بات پر بھی غور
کریں اور جیسے بھی کریں اس کا تعلق ذہن کے ساتھ ضرور ہوگا۔

فلسفۂ مادیت کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فلسفہ مابعد الطبعیاتی

تصورات کو بھی مادی تصورات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ایک عام آدمی جب اپنے گردو پیش پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے ہر طرف مادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو بھی مادی حقائق تسلیم کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر 'وجود'، 'کیفیت'، 'کمیت'، 'تعداد'، 'حالت'، 'یکسانیت'، وغیرہ مابعد الطبیعیاتی تصورات ہیں مگر فلسفۂ مادیت کا ماہر ان کو بھی مادی حقائق قرار دیتا ہے۔

مسئلہ زیر بحث پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارا سارا علم، تجربہ اور وجدان کی پیداوار ہے۔ یہ تجربہ مشاہدہ کا حاصل نہیں البتہ مشاہدہ اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ انسانی ذہن تجربات و مشاہدات میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کو اسباب و علل کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے۔ اگر ذہن پہلے ہی سے ان مشاہدات کے لئے قانونِ اسباب مہیا نہ کرتا تو ان سے علم کا حصول ممکن نہ ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قوانین تجربات سے پہلے کے ہیں اور انسان کا علم ان قوانین اور مشاہدات کے میل جول سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مذکورہ صدر حقائق سے مادی فلسفہ کے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے کہ انسانی ذہن مدد سے کام لئے بغیر ہم اس کائنات کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

سوال ۲۲ :۔ فلسفۂ مادیت کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ مادی قوانین عالمگیر ہیں؟ اس پر عالمانہ تنقید کیجئے۔

جواب :۔ فلسفۂ مادیت کا یہ دعویٰ کہ یہ کائنات یا مادی قوانین ہمہ گیر اور ہر چیز پر حاوی ہیں قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ سائنس دان آج تک اس بات کو ثابت نہیں کر سکے کہ قوت حیات (حیاتی توانائی) طبیعیاتی یا کیمیاوی توانائی کی تبدیل شدہ

صورت ہے ۔ مادۂ حیات اگرچہ ایک کیمیائی مرکب ہے مگر سائنسدانوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ مختلف عناصر کو یکجا کر کے ان میں حیات پیدا کر دیں۔ عناصر یکجا ہو کر بھی بے جان ہی رہیں گے ۔ جن چیزوں میں نشوونما کی قوت نہیں پائی جاتی ۔ وہ افزائش نسل کی صلاحیت سے بھی خالی ہیں ۔ اگر ایک چیز کسی وقت میں صرف کیمیائی خصوصیت رکھتی ہو اور کسی دوسرے وقت اس میں نشوونما یا افزائش نسل کی خصوصیت پیدا ہو جائے تو یہ چند جدید عوامل کا نتیجہ ہوگا جو پہلے اس میں نہ تھے ۔ اگر یہ عوامل اس میں پیدا نہ ہوتے تو وہ چیز جدید خصوصیت سے بہرہ ور نہ ہو سکتی تھی ۔

اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ مادہ میں زندگی کے آثار پوشیدہ ہیں تو بھی حیات کا مادی ہونا لازم نہیں آتا ۔ موٹی سی بات ہے کہ حیات اور غیر حیات دونوں باہم متضاد چیزیں ہیں لہٰذا ان دونوں پر ایک قانون کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا حیات کی سادہ سے سادہ صورت سے لے کر اس کی اعلیٰ و ترقی یافتہ صورتوں تک کہیں بھی ہمیں میکانکی قوت کی کارفرمائی نظر نہیں آتی ۔ بخلاف اس کے جاندار چیزوں میں مادی اسباب کے علاوہ ایک غیر محسوس سبب پایا جاتا ہے جو زندگی پیدا کرنے کا موجب ہے جسے ہم سبب نفسی (SELF CAUSATION) کہہ سکتے ہیں ۔ جاندار چیزوں میں مادی اسباب کی بجائے ایک اندرونی حرکت پائی جاتی ہے ۔ اسی حرکت کے باعث ان میں خواہشات اور شعور پیدا ہوتا ہے جو ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے اپنے انتہائی مقام تک پہنچ جاتا ہے ۔

سوال ۲۳ :۔ زندگی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتائیے کہ کون سے امور اس کو مادہ سے ممتاز کرتے ہیں ؟

جواب :۔ زندگی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو وحدت و تنظیم پائی جاتی ہے وہ مادہ میں مفقود ہے۔ یوں تو پتھر میں بھی یکساں قسم کے اجزا پائے جاتے ہیں جن سے وہ ترکیب پاتا ہے مگر پتھر کی وحدت اور ایک ذی حیات چیز کی وحدت میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ پتھروں کے ڈھیر کو آپ سب الگ الگ کر دیں گے تو ہر پتھر جداگانہ وحدت کا حامل بن جائے گا۔ ایک پتھر کے الگ الگ ٹکڑے اپنی اپنی جگہ کامل وحدت ہیں۔ ان کو یکجا کریں تو یہ ایک بے ربط ڈھیر بن جاتا ہے۔

انسانی یا حیوانی زندگی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ایک انسان میں اجزا اس انداز سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ اگر ان کو الگ کر دیا جائے تو وہ اپنی افادیت کو کھو دیتے ہیں اور ان کی انفرادی وحدت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کے ہاتھ یا کسی عضو کو کاٹ دیا جائے تو اس کی عضوی حیثیت زائل ہو جاتی ہے۔ انسانی اعضاء کو بحیثیت مجموعی بدن کہتے ہیں اگر ان کو الگ الگ کر دیا جائے تو ان میں سے کسی عضو کو بدن نہیں کہہ سکتے۔ انسانی اعضاء کی اس وحدت کو عضوی وحدت (ORGANIC UNITY) کہتے ہیں۔ انسانی اعضاء اور بدن میں جزء اور کل کا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ تعلق کسی مادی قوت کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اندرونی قوت پر مبنی ہے جسے حیات کہتے ہیں۔ انسانی بدن اور اسی طرح تمام ذی حیات اشیاء ایک بامقصد کل ہیں۔ ان کے تمام اجزا اپنے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ کوئی جزو دوسرے جزو کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ گویا بدن بحیثیت کل اور اجزا بحیثیت جزو لیتے اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔ ظاہر ہے کہ مادہ میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

زندگی کی تیسری اور سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہے کہ انسانی شعور

ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے خود شناسی کے مقام کو چھو جاتا ہے۔ خود شناسی ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان خود ہی عالم ہوتا ہے۔ خود ہی معلوم اور خود ہی علم۔ یہاں پہنچ کر انسان سب امتیازات کو بھول جاتا ہے اور ایسی وحدت میں گم ہو جاتا ہے جس میں کل اور جزو کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس مقام پر پہنچ کر مذہب انسان کی دستگیری کرتا ہے اور اس پر احکام ربانی کی صداقت منکشف ہونے لگتی ہے۔

زندگی کے یہ مظاہر اور خاص طور پر خود شناسی کا مقام ارفع مادی مظاہر سے اس قدر مختلف ہے کہ اسباب و علل کا مادی قانون ان کی تشریح سے قاصر رہتا ہے۔ یہ بات یوں بھی بعید از عقل ہے کہ خود شناسی ایسے اعلیٰ مظہر پر ایک ایسے قانون کا اطلاق کیا جائے جو ادنیٰ مظاہر کے لئے بنایا گیا ہے۔ اعلیٰ قانون سے اسفل مظاہر کی تشریح تو کر سکتے ہیں مگر اس کا عکس ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفۂ مادیت زندگی کے اعلیٰ مظاہر کی توضیح سے قاصر رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں شعور اور ادراک کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

سوال ۲۴:۔ کیا مادی فلسفے کا رد خود اسی کے مہیا کردہ دلائل سے ممکن ہے؟ تفصیلاً لکھئے۔

جواب:۔ اگر ہم مادی فلسفہ پر ایک اور طریقہ سے غور کریں تو خود اس کے نظریات ہی سے اس کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے۔ طبعیاتی علوم کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حرارت، روشنی، بجلی، مقناطیس وغیرہ ایک ہی مشترک توانائی کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں جو خود بخود یا کسی دوسرے عمل کے ذریعہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ کیمیاوی مظاہر کا بھی یہی حال ہے اور تو

اعد زندگی جس مادۂ حیات پر مشتمل ہے وہ بھی چند کیمیائی عناصر کا مجموعہ ہے۔ سائنس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کا عمل زندگی کے تمام مظاہر میں جاری ہے۔ ایک ادنیٰ جاندار اسی طرح زندگی سے بہرہ ور ہے جس طرح اشرف المخلوقات انسان۔ البتہ زندگی کی نوعیت میں فرق ہے۔

اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نباتات میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ بعض نباتات اس قدر ترقی یافتہ ہیں کہ ان میں اور نچلے درجے کے حیوانات میں فرق کرنا دشوار ہے۔ اگر بعض خصوصیات کی بنا پر ہم حیوانات میں زندگی کے قائل ہیں تو ان ہی دلائل کی رُو سے نباتات کو کیوں نہ زندہ تسلیم کیا جائے۔ مزید غور و فکر سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ابتدائی نباتات میں چند چیزیں ایسی ہیں جن کو جمادات سے تمیز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مرجان میں نباتات کی طرح قوت نشوونما موجود ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جمادات بھی صفتِ حیات سے خالی نہیں۔ اگرچہ جمادات کی حیات اس درجہ ترقی یافتہ نہ ہو جیسے انسان کی زندگی۔

اس مقام پر پہنچ کر زندگی کی حقیقت آشکار ہو گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ کائنات عالم کے ہر ذرہ میں حیات پائی جاتی ہے نیز یہ کہ مادی اجسام میں حیات کو کہیں باہر سے نہیں لایا جاتا بلکہ وہ پہلے ہی ان کے اندر موجود ہے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد مادی فلسفہ کے تمام دلائل و براہین از خود باطل ہو جاتے ہیں۔

نفسیات اور مذہب

سوال ۲۵:۔ یہ بات کس حد تک درست ہے کہ نفسیات کا علم مذہب کا ابطال کرتا ہے؟ نیز ولیم جیمس نے مذہب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تنقید کیجئے۔

جواب:۔ نفسیات ایک جدید علم ہے جس نے پچھلی صدی میں حد درجہ ترقی کی ہے۔ نفسیات کے علمبرداروں نے مذہب کی مخالفت ضرور کی ہے مگر مذہب کا ابطال ثابت کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ البتہ نفسیات کے بعض نظریات سے مذہب کو نقصان پہنچا ہے۔ ان میں کرداریت (BEHAVIORISM) کا نظریہ بھی شامل ہے۔ یہ نظریہ مادی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ یہ نظریہ انسانی اعمال وافعال کی تشریح کے لئے کافی نہیں اور اسے خود اپنی خامی کا اعتراف ہے۔

نظریہ کرداریت کے حاملین کے علاوہ جن ماہرین نفسیات نے مذہب کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ان میں ولیم جیمس، لیوبا اور فرائڈ کے اسماء قابل ذکر ہیں فرائڈ کے زیر اثر جو دیگر نفسیاتی مکتبہ ہائے فکر رونما ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے انداز میں مذہب کا ذکر کیا ہے۔ ولیم جیمس کو ان تینوں میں تقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔ اس نے ۱۹۰۲ء میں "مذہبی وجدان کی اقسام" کے عنوان سے اڈنبرا میں لیکچر دیئے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع کئے گئے اس کتاب میں ایک جدید انداز سے مذہب کی نفسیاتی توضیح کی گئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ان ماہرین نفسیات کی تردید میں لکھی گئی تھی جو سمجھتے تھے کہ مذہب ایک معمولی چیز ہے جس کی نہایت آسان نفسیاتی توجیہہ ممکن ہے۔ جیمس نے

منکرین مذہب کو یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ نظام ہائے مذہبی میں ان کی دانست سے کہیں زیادہ مواد موجود ہے۔ اس کتاب میں ولیم جیمس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب کے لئے ایک بنیاد مہیا کی جائے۔ وہ مذہب کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اس کا انداز صرف مدافعانہ تھا۔ وہ مذہب کی اہمیت کے اثبات میں مثبت دلائل پیش نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب سے مذہب کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچا۔ ولیم جیمس کے خیالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مذہبی علماء کے اکثر وجدان ایک نفسیاتی مرض سے زیادہ نہیں ہوتے جو ذہنی ناہمواری کا نتیجہ ہوتا ہے تاہم اس بات کا امکان ہے کہ ایسے وجدانات سے ایک مثالی زندگی کا تصور حاصل کیا جا سکے۔

۲۔ مذہبی وجدان سے حقیقت کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ وجدان صرف صاحب وجدان ہی کے لئے مفید ہے۔ دوسروں کے لئے اس کا قابل قبول ہونا ضروری نہیں۔

۳۔ مذہبی حقائق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انہیں سائنٹفک اصولوں پر صحیح ثابت کیا جائے۔ سائنسی طریقہ سے جانچ پڑتال مذہبی حقائق کی صداقت کے لئے معیار نہیں ہے۔

ولیم جیمس کی مساعی سے مذہب کو بہت کم فائدہ پہنچا۔ وہ دلائل کی روشنی میں مذہب کی اہمیت و ضرورت ثابت نہ کر سکا۔ ان دنوں یہ نظریہ مذہبوں پر تھا کہ مذہبی عقائد چونکہ عقل کی ترازو میں پورے نہیں اترتے لہذا ان کو رد کر دینا چاہیئے۔ جیمس نے اس نظریہ کا ابطال کرنا چاہا مگر اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مذہبی عقائد کا عقل کے معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں البتہ ایسے عقائد کا انتخاب ضروری ہے جو ہمارے عمل کی اچھی طرح رہنمائی کر سکیں۔ اگرچہ وہ عقلی معیار پر پورے نہ اترتے

ہوں۔ جیمس کے طرزِ استدلال میں سب سے بڑا نقص جو مذہب کے حق میں ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اس کے یہاں مذہبی وجدان کی صحت یا عدمِ صحت کا کوئی معیار نہیں۔ اس کے نزدیک وجدان ایک عام منظر ہے جو تمام اقوام و ازمنہ میں قدرِ مشترک کے طور پر پایا جاتا رہا ہے۔ جیمس یہ بھی کہتا ہے کہ مذہب کی حقیقت وہ قدرِ مشترک نہیں ہے جسے تمام مذاہب میں تلاش کیا جائے بلکہ مذہب کی حقیقت تو صحیح معنوں میں اس اختلاف سے معلوم ہوتی ہے جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں پایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مذہب ایک مبہم سا جذبہ بن کر رہ جائے گا۔ جیمس کے قول کے مطابق اسلام اور مسیحیت میں کچھ فرق باقی نہیں رہے گا۔ جس طرح انسانیت، وحشت و تہذیب کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ دونوں کے اختلاف سے انسانیت کی حقیقت کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہب کی حقیقت ان عوامل سے معلوم نہیں کی جا سکتی جو دنیا کے تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان کے باہمی اختلافات سے مذہب کی حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

ولیم جیمس کا قول ہے کہ نہ تو مذہبی وجدان کو نقل کر کے دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے لئے وہ کوئی حتمی و یقینی چیز ہے۔ جیمس کے نزدیک مذہبی لوگوں اور دیوانوں میں فرق و امتیاز دشوار ہے۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ انبیائے عظام اور دیگر مذہبی اکابر (نعوذ باللہ) سب دیوانے تھے۔ جیمس کے قول سے ضرورتِ ارشاد کی بے وقعتی بھی واضح ہے۔ مذہبی وجدان سرے سے جب قابلِ نقل ہی نہیں اور نہ دوسروں کے لئے واجب الاتقان ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جیمس کے قول کے مطابق مذہب ایک ہنگامی ضرورت کی چیز ہے اور اس کے قبول کرنے کا صرف ایک ہی اصول ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر انسان مذہبی عقائد کو اپنے عمل کی

رہنمائی کے لئے استعمال کر سکتا ہے تو اسے ان عقائد کو قبول کر لینا چاہیئے۔ گویا مذہب کی ضرورت ایک مشروط چیز ہے۔

جیمس کا نظریہ کہ مذہبی رہنماؤں کے وجدان نفسیاتی مرض کا مظہر ہیں خود اس کے اپنے فلسفہ کی روشنی میں بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ انسانیت اس امر کی زندہ گواہ ہے کہ انبیائے کرام اور بزرگان دین نہایت پاکیزہ سیرت اور نیک نہاد تھے۔ یہ قول ان پر بہتان عظیم ہے۔ ولیم جیمس مذہبی رہنماؤں اور دیوانوں میں فرق نہ کر سکا حالانکہ سائنٹیفک طریقہ سے بھی ان کے وجدانات کا فرق واضح ہو سکتا ہے۔

سوال ۲۶:۔ لیوبا نے مذہب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تنقید کیجئے؟

جواب:۔ لیوبا نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مذہب ایک نفسیاتی عمل ہے۔ بنا بریں خدا اور آخرت کا وجود اور دیگر مذہبی عقائد کسی طرح بھی حقیقی نہیں ہو سکتے۔ لیوبا کا قول ہے کہ جو نفسیاتی قوانین مذہبی مظاہر میں کار فرما ہیں۔ وہ ان مادی قوانین سے بالکل مختلف نہیں جن سے ہم مادی اجسام کی حرکت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جس طرح ایک راکٹ کے مدار کا تعین ممکن ہے اور اس کی حرکت اور منزل مقصود کا پتہ چلایا جا سکتا ہے اسی طرح مذہبی وجدان اور اس کے آغاز و انجام کو بھی متعین کیا جا سکتا ہے مگر لیوبا کا یہ قول درست نہیں۔ ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طبیعیاتی علوم میں جو پیشین گوئیاں ہم کر سکتے ہیں نفسیاتی مظاہر میں نہیں کر سکتے مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچہ چونکہ ایک خاص درجہ ذہانت کا حامل ہے اس لئے وہ امتحان میں وظیفہ حاصل کر لے گا۔ اگر یہ پیشین گوئی درست نکلتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ نفسیاتی قوانین صحیح ہیں ورنہ غلط۔ مگر یہ

کہنا کہ مذہبی وجدانات کے بارے میں ہم کو نفسیاتی علم پر اتنا عبور حاصل ہو چکا ہے کہ ہم ان تمام عوامل سے آگاہ ہیں جو اس قسم کے مظاہر میں کارفرما ہیں عظیم جسارت ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود علم نفسیات نے بھی ابھی تک یہ دعویٰ نہیں کیا۔

مابعد الطبیعیاتی امور کو تسلیم کرنے سے صرف اس لئے انکار کرنا کہ ہمیں نفسیاتی طور سے ان کی معرفت حاصل ہو گئی ہے نہ اب ممکن ہے اور نہ قریب زمانہ میں اس کی امید کی جا سکتی ہے۔ مذہبی وجدانات کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی نفسیاتی قانون سے متصادم نہیں ہیں۔

لیوبا کے نظریات کی بنیاد دراصل مذہبی رہنماؤں کا یہ یقین ہے کہ مذہب وجدان پر مبنی ہے۔ بے شک یہ درست ہے کہ لوگوں کے وجدانات بڑی حد تک مذہب کی اساس ہیں مگر یہ مذہب کی ضرورت کی صرف ایک دلیل ہے۔ اس لئے کہ مذہب کی صداقت میں اور بھی بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کسی ایک دلیل کو مختص کر لینا شیوۂ انصاف سے بعید ہے۔ عقلی شہادتیں، مذہبی وجدانات، نظم کائنات، انسان کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات سب مل کر مذہب کی ضرورت و اہمیت کی تشکیل کرتی ہیں۔

سوال ۲۷:۔ سگمنڈ فرائڈ نے مذہب کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ اس کے نظریات پر تبصرہ کیجئے۔

جواب:۔ سگمنڈ فرائڈ مذہب کو صرف ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ایک التباس کا مستقبل" (THE FUTURE OF AN ILLUSION) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ایک مغالطہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مذہب کے

ایک مغالطہ ہونے کا دعویٰ فرائڈ نے سادہ لوحی کی بنا پر نہیں کیا بلکہ وہ اس پر کامل یقین رکھتا اور مذہبی اصولوں کو کاذب سمجھتا تھا۔ اس کی کتاب کا نقطۂ آغاز یہ مفروضہ ہے کہ اگر مذہبی عقائد ایک مغالطہ ہیں تو پھر لوگ ان میں شدید ایمان کیوں رکھتے ہیں ؟۔ فرائڈ کے نزدیک مذہبی عقائد لاشعوری اور غیر عقلی قوتوں کی پیداوار ہیں انسان نے آغازِ تخلیق سے اپنے آپ کو فطری مظاہر کے درمیان محصور اور بے بس پایا۔ مذہبی عقائد نے انسان کو ایک مضبوط قلعہ کی طرح پناہ دی۔ پھر معاشرے کی ترقی ہوئی تو مذہبی عقائد نے معاشرتی احکام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ خدا کے تصور اور دیگر مذہبی عقائد نے انسان کو تسکین و اطمینان کی دولت سے مالا مال کیا۔ معاشرتی احکام کے تحفظ کے لئے انفرادی قربانیوں کو ایک مذہبی فعل تصور کیا جانے لگا۔

فرائڈ کے قول کے مطابق مذہبی عقائد کو اس لئے قبولِ عام حاصل ہوا کہ انہوں نے انسان کی ایک وقتی ضرورت پوری کی تھی، اس لئے نہیں کہ وہ حق و صداقت پر مبنی تھے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں کہ مذہبی عقائد بالکل غلط تھے۔ فرائڈ نے التباس یا مغالطہ کا لفظ ہر ایسے اعتقاد کے لئے استعمال کیا ہے جو انسان کی پوشیدہ خواہشات کی پیداوار ہو مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عقیدہ غلط ہو۔ فرض کیجئے ایک شخص خدا کا منکر ہے تو اس کا انکار اس قسم کا ایک التباس ہے جیسے اس کا اقرار۔ فرائڈ نے جو نفسیاتی اصول پیش کئے ہیں وہ مذہبی عقائد کو جھٹلا نہیں سکتے۔ غالباً فرائڈ نے مذہبی اصولوں کو اس لئے غلط سمجھا کہ ان کو عقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ فرائڈ کی یہ منطق کسی طرح قابل قبول نہیں کہ مذہبی عقائد چونکہ انسانی خواہشات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اس لئے غلط ہیں، اس لئے کہ خواہش صحیح چیز کی بھی کی جا سکتی ہے اور غلط کی بھی۔ ایک شخص دنیوی زندگی کو آخری قرار دیتا ہے اور

دوسرا اخروی زندگی کا طالب ہے۔ حقیقت کا فیصلہ انسان کی چاہت اور طلب سے نہیں بلکہ خود حقائق کے پیش نظر کیا جائے گا۔

عقائد کی اہمیت کو گھٹانے کے سلسلہ میں یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ فرائڈ اگرچہ مذہبی عقائد کا ابطال نہ کرسکا تاہم اس نے مذہبی عقائد کی اہمیت کو گھٹانے کے سلسلہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ فرائڈ کے متبعین نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ مذہب لاشعوری خواہشات پر مبنی ہے مثلاً تحلیل نفسی کا ایک ماہر یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اس لئے خدا پر ایمان لاتے ہیں کہ آپ بچپن میں والد کے محتاج تھے اور یہ احساس احتیاج آپ میں ابھی تک موجود ہے۔ آپ نے یہ احساس اپنے باپ سے خدائی باپ کی طرف منتقل کر دیا اور اس طرح خدا پر ایمان لے آئے۔ اس دلیل میں اگرچہ کوئی منطقی ربط نہیں پایا جاتا۔ تاہم فیشن کی بنا پر بعض غیر معقول باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فرائڈ کے نظریات اگرچہ مذہبی عقائد کی صداقت کو جھٹلا نہ سکے مگر اس نے منکرین مذہب کو دلائل کے اسلحہ سے مسلح کر دیا اور وہ مذہب کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

مذہب اور ضابطۂ اخلاق

سوال ۲۸ :۔ مذہب اور اخلاق کے ربط و تعلق کی تفصیلات بیان کیجئے۔

جواب :۔ دنیا میں مظاہر پرستی کا زور ہے۔ ہر شخص اسی چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے جو ظاہری طور پر پرکشش اور دلفریب ہو۔ اگرچہ اس کا باطن کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو۔ یہی حال مذہب کا بھی ہے۔ اکثر لوگ مذہبی تعلیمات میں بیان کردہ اخلاق سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب کا حاصل اخلاق کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اخلاقیات کے باب کو الگ کر لیا جائے تو کتاب مذہب میں کوئی دلربائی و رعنائی باقی نہیں رہتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کے فوائد و مصالح نمایاں اور محسوس ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب کے دوسرے نتیجہ بخش پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ان کی مثال یوں ہے جیسے اکثر لوگ آفتاب درخشاں کی تابانی و درخشانی میں گم ہو کر اس بات پر غور کرنے کی مطلقاً ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آفتاب کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیونکر عالم وجود میں آیا اور اس کا صانع و خالق کون ہے؟

جو لوگ اخلاقیات کے سوا دیگر مذہبی تعلیمات سے متنفر ہوتے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ اخلاق کا منبع مذہب نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ جو لوگ مذہبی عقائد کو کچھ زیادہ خطرناک نہیں سمجھتے مگر مذہبی تعلیمات کے ذوق سے آشنا بھی نہیں ہوتے وہ اخلاقیات ہی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہر مذہب میں کسی حد تک اخلاقی تعلیمات موجود ہوتی ہیں۔

اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر مذہب لائق اتباع اور اس کی پیروی موجب نجات ہے ۔ یہ دونوں فریق غلط کار ہیں ۔ اخلاق کی اشاعت مذہب کے بغیر ممکن ہے اور نہ مذہب صرف اخلاقیات میں محدود ہے بلکہ مذہب میں اخلاق کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے ۔

انسان طبعاً حریص واقع ہوا ہے ۔ جب وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے تو پہلے یہ سوچتا ہے کہ اسے کیا فائدہ حاصل ہوگا ۔ وہ برائی سے اسی صورت میں باز رہتا ہے جب سزا کا خوف دامنگیر ہو ۔ اگر طالب علم کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ علم بے بہا فوائد کا موجب ہے تو وہ رات کی میٹھی نیند سے کبھی محروم نہ رہے ۔ کسان موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں ہل چلانے میں مصروف ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوا اور سایہ سے لطف اندوز نہیں ہوتا ۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اگر ٹھنڈے سایہ سے بہرہ اندوز ہوتا رہا تو سال بھر فاقہ کشی سے دوچار ہونا پڑے گا ۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتا ۔ خوشحال ہونے کی صورت میں وہ مہنگے داموں چیزیں خرید کر اپنے مصرف میں لاتا ہے ۔ چیزیں ارزاں خرید کر ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور دوسروں کی تکلیف کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ ظلم و ستم ، دوسروں کی حق تلفی ، جانداروں پر زیادتی کرنا اور لوٹ کھسوٹ ، یہ برائیاں ہر جگہ عام ہیں ظاہر ہے کہ ملکی قوانین ان برائیوں کو ختم نہیں کر سکتے بلکہ ان سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت ہے جو انسان کو نیکیوں پر آمادہ کرے اور برائیوں سے روکے اگر قانون کی افادیت کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ لوگ جو دائرۂ قانون میں داخل نہیں یا اقتدار کی باگ ڈور پر قابض ہیں قانون کے پابند نہیں ہوں گے ۔ بنا بریں امن عالم کو قائم رکھنے ، لوگوں کو قانون کا پابند کرنے اور مظالم

کے انسداد کا صرف ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس سے مذہب اور اخلاق کا ربط و تعلق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

سوال ۲۹ :- حامیلین تہذیب جدید کا دعویٰ ہے کہ "اخلاق حسنہ کی تکمیل مذہب کے بغیر ممکن ہے لہٰذا مذہب کی کوئی ضرورت نہیں"۔ اس پر تبصرہ کیجیے؟

جواب :- اپنے آپ کو مہذب قرار دینے والوں کے تہذیب جدید کے بارے میں یہ دعاوی "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" کے مصداق ہیں۔ تہذیب جدید کے علم برداروں نے کمزور اقوام پر جو مظالم ڈھائے ہیں اور جس طرح انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی لاحاصل کی ہے وہ انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس کی روشن مثال ہندوستان میں انگریزوں کا عہد اقتدار ہے۔ انگریز نے اپنے عہد سلطنت میں ہندوستانیوں کی تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ایسے ہتھکنڈے جاری رکھے جن سے اہل ہند کے دور غلامی کو طویل سے طویل تر بنایا جا سکے۔ تہذیب کے دعویداروں نے محکوم اقوام کو جس طرح اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور انسانوں کو حیوانوں سے بھی کم تر درجہ تک پہنچا دیا وہ مہذب قوموں کے اخلاق کی ایک زندہ مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہذب اقوام کا حسن سلوک ہمیشہ انھی اقوام تک محدود رہا جو قوت و شوکت میں ان کی ہم پلہ تھیں۔ اپنے آپ کو مہذب کہنے والے کمزور اقوام سے بہیمانہ سلوک روا رکھتے رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب نے آغاز کار سے انسانی اخلاق پر جو انمٹ نقوش ثبت کئے تھے، وہ صدیوں میں بھی زائل نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ چند نسلوں کی مادی

تعلیم اس کو بالکل فنا کر دے۔ مذہب نے انسانی قلوب و اذہان پر یہ پائیدار اثر چھوڑا ہے کہ برائی رُوح کو تاریک کر دیتی ہے۔ مذہب ہی کے زیر اثر سب عاقل و جہلاء اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قانون سازِ حقیقی ذات باری تعالیٰ ہے جو اس کائنات ارضی کے چپہ چپہ پر حکمران ہے۔ مذہب ہی کی برکت سے یہ خیال اب تک تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

مذہب کے بغیر اخلاقی ترقی کے امکانات اس وقت روشن ہوں گے جب خدا سے انکار اور الحاد و دہریت کی عمر بھی اتنی ہی طویل ہو جتنی مذہب کی۔ حالانکہ مذہب کی عمر بہت طویل ہے اور اس کے اثرات بڑے دیرپا ہیں۔ اس کے مقابلہ میں لادینیت کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔ اگر خدا نخواستہ کبھی الحاد کا ایسا دور آئے کہ سب لوگ منکرِ خدا ہو جائیں تو وہ تاریخ انسانی کا منحوس ترین دور ہوگا۔ اس وقت نہ حکومت قیام امن کی مساعی میں کامیاب ہو گی۔ نہ قانون کا خوف لوگوں کو راہ راست پر لا سکے گا۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے انسانیت ایسا دن کبھی نہیں دیکھے گی اور مذہب کی مخالفت کرنے والے اپنے مقاصد مذمومہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ مذہب انسانی فطرت میں داخل ہے۔ "وَلَنْ تَجِدَ لِفِطْرَتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا"

منکرین مذہب ہزار کوشش کریں وہ مذہب کو نیست و نابود نہیں کر سکتے در اصل بات یہ ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان کی جبلت میں داخل اور اس کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے اور اسے ذہن و قلب سے نکال باہر کرنا انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو منکرِ مذہب کہتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی چیز کو معبود کا درجہ دے کر غیر شعوری طور پر مذہبی آدمی بن جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنا مذہبی آدمی ہونا تسلیم نہ کریں۔

روحِ تہ الکبریٰ والوں نے ملک کو دیوتا تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر رل نے انسانی زندگی کو معبود کا درجہ دیدیا۔ در اصل مذہب اور اخلاق کا تصور انسانی فطرت میں اتنا گہرا ہے کہ اس تصور سے رہائی ممکن نہیں۔

سوال نمبر ۳۰:۔ ڈاکٹر رل کا قول ہے کہ "خدا کو ماننے کے بجائے اگر انسانی زندگی کو معبود تسلیم کر لیا جائے تو بھی اخلاقی اقدار کو زندہ رکھا جا سکتا ہے"۔ اس پر تنقید کیجیے۔

جواب:۔ ڈاکٹر رل سے پہلے روحِ تہ الکبریٰ والوں نے بھی اسی نظریہ کا اظہار کیا تھا مگر عملی طور پر وہ اپنے قلب و ذہن سے مذہب کے اثرات کو مٹا نہ سکے۔ ڈاکٹر رل کا یہ استدلال کہ نوع انسانی کی عمر چونکہ طویل اور بے انتہا ہے اس لئے عمر کو خدا مان لینا چاہیئے، بڑا مضحکہ خیز ہے۔ بھلا طوالت عمر کا خدا ہونے سے کیا تعلق؟ یہ تو اسی طرح ہوا جیسے کہا جائے چونکہ خدا کو ماننے کا عقیدہ انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور وہ خدا کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے لہذا اصلی اور حقیقی خدا کی بجائے مصنوعی خدا کیوں نہ گھڑ لیا جائے۔ یہ کتنی لغو بات ہے۔ خالق حقیقی کے ہوتے ہوئے من گھڑت خداؤں کو اختراع کرنا کس قدر بعید از قیاس ہے۔ پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جب قیام قیامت اور جزا و سزا کے عقیدہ سے صرف نظر کر کے عمر انسانی کو معبود تسلیم کیا جانے لگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کو عیش و لذت کی نذر کر دیا جائے۔ جب تک دنیا کی حیات ناپائیدار کے علی الرغم ایک بلند پایہ اور ابدی زندگی کا تصور پیش نظر نہ ہو نہ نیکی کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائیوں سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

ڈاکٹر رل نے اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کے لئے مذہب سے قطعِ نظر ایک تجویز
یہ پیش کی ہے کہ اپنے آباؤ اجداد اور بزرگوں کی روحوں کو حاضر مان کر ان کی خوشنودی
حاصل کی جائے۔ اس طرح خدا کو تسلیم کئے بغیر اخلاقِ حسنہ کی تحریک کے لئے
ایک زبردست محرک ہمارے سامنے ہوگا۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی
ہے کہ ڈاکٹر رل اخلاق کی تحریک کے لئے کوئی مخصوص محرک پیدا کرنا چاہتے ہیں
مگر جہاں آکر ٹھہرتے ہیں دیکھا جائے تو بھروسہ اسی غیر محسوس طاقت پر ہے۔
یہ دوسری بات ہے کہ وہ محرک خدا کی بجائے بزرگوں کی روحیں ہوں۔ یہ امر
بھی قابلِ غور ہے کہ ایک طرف تو فلسفہ یہ کہتا ہے کہ روح کوئی چیز نہیں اور مرنے
کے بعد جسمانی اجزا اپنے اپنے عناصر میں مل جاتے ہیں اور غبار بن کر اڑ جاتے
ہیں۔ اور دوسری جانب ڈاکٹر رل ارواح کی رضاجوئی کو اخلاقِ حسنہ کیلئے
محرک قرار دیتے ہیں۔ اس تضاد بیانی میں جمع و تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

خلاصہ یہ کہ فطرتِ انسانی میں داخل ہونے کی بنا پر مذہب کی اصلاح و
ترقی جس طرح فرضِ عین ہے اسی طرح محرکِ اخلاقِ حسنہ ہونے کے لحاظ سے
مذہب کی نشر و اشاعت اخلاقی فریضہ ہے۔

سوال ۱۱ :- بعض لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ اخلاقی
تعلیم سب مذاہب میں موجود ہے اس لئے سب
مذہب درجہ کے اعتبار سے مساوی ہیں اور سب ہی باعثِ نجات
ہیں۔ اس کے موافق یا مخالف آپ جو رائے رکھتے ہوں اسے دلائل
سے ثابت کیجئے؟

جواب :- کسی مذہب کی اہمیت صرف اسی بات سے واضح نہیں ہوتی

کہ اس نے اخلاقیات کے بارے میں کیا تعلیم دی ہے۔ بخلاف ازیں کسی مذہب
کا اصل معیار وہ تصور ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور دیگر بنیادی مسائل
کے بارے میں پیش کیا ہو۔ جو لوگ صرف اس لئے تمام مذاہب کو باعث
نجات سمجھتے ہیں کہ سب میں اخلاقی تعلیم موجود ہے وہ لوگ مذہب کی اہمیت
سے آگاہ ہونے کے باوجود مذہب کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آغازِ
آفرینش سے لے کر اب تک مذہب کی تمام شکلوں میں ہستی باری تعالیٰ کا
یقین اور اس کا قرب حاصل کرنے کو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا جاتا
ہے۔ جب مذہب کا حاصل قربِ خداوندی کا حصول ہے تو ماننا پڑے گا
کہ اخلاقِ حسنہ مثلاً رحم و کرم، عدل و انصاف، شرافت و شجاعت وغیرہ
مذہب سے بیگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح بہادرانہ کارنامے انجام دینے
سے آدمی تجارت کا ماہر نہیں بن سکتا اور تجارتی امور میں مہارت حاصل کر
کے وہ اعلیٰ درجہ کا معمار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح محض اخلاقِ حسنہ سے موصوف
ہو کر کوئی شخص معرفتِ الٰہی کا ذوق آشنا نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ محض اخلاق کی مدد سے خدا کی معرفت
حاصل کر لیں گے وہ گویا جو بو کر گندم کاٹنے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔
جب دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ہر مقصد کے حصول
کے لئے اس کے مناسب اسباب پیدا کئے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ
معرفتِ ربانی حاصل کرنے کے لئے مذہب کی پناہ نہ لی جائے۔ اصل بات
یہ ہے کہ جو لوگ محض اخلاق میں مذہب کا سراغ لگانا چاہتے ہیں وہ
اندرونی طور پر مذہب کے منکر ہیں مگر برملا اس کے اظہار کی قدرت سے
محروم ہیں۔ مذہب دشمنی میں یہ لوگ منکرین مذہب سے کسی طرح کم نہیں

اور اگر ان کا بس چلے تو مذہب کی بیخ کنی کر دیں۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بعد انسان میں یہ داعیہ ابھرتا ہے کہ اس کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے۔ تعلق باللہ کے قیام کا ایک ذریعہ تو یہ ہے کہ شرعی طریق پر اس کی عبادت کی جائے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ خداوندی اوصاف مثلاً رحم و کرم، لطف و مروّت، عدل و احسان وغیرہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ انسان اپنی استطاعت کی حد تک ان اوصاف کو حاصل کرے اور مخلوقِ خدا کے ساتھ وہی سلوک روا رکھے جو اپنے ذہن میں خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق سے تعلق باللہ کے قیام میں کس حد تک مدد ملتی ہے یوں تو جملہ مذاہب میں اخلاقی تعلیمات کی بھرمار ہے مگر اسلام نے اخلاقیات کو جزوِ دین قرار دیا ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اخلاق و عبادت سے اسی قدر تعلق باللہ پیدا ہوگا جس درجہ کی معرفتِ خداوندی قبل ازیں حاصل ہو چکی ہے مثلاً اگر کوئی شخص خدا کو مجسم سمجھ کر اس کی عبادت کرتا ہو اور عبادت کرنے سے اس کے دل پر یہ عقیدہ ثبت ہو جائے کہ وہ جسم نہیں رکھتا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاق تعلق باللہ کے قیام میں اگرچہ مفید ہیں تاہم مذہب کا دار و مدار معرفتِ خداوندی ہی پر ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ معرفتِ خداوندی حاصل کئے بغیر صرف اخلاق کی مدد سے کوئی شخص عارفِ کامل بن جائے اور فقط حسنِ معاشرت کے بل بوتے پر اسے خدا تک رسائی حاصل ہو جائے۔

مذہب ایک انسانی ضرورت ہے

سوال ۳۲ :۔ دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ مذہب ایک فطری ضرورت ہے؟

جواب :۔ انسان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ وہ سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو اور اس میں قلق و اضطراب کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ نظامِ تسکینِ کامل کے حصول کا ذریعہ انسانی جذبات کی تسکین ہے۔ انسانی جذبات کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ وہ جذبات جن کی فوری تسکین مطلوب ہے۔ مثلاً بھوک، پیاس وغیرہ۔

۲۔ وہ جذبات جن کی دائمی تسکین ضروری ہے۔

مذہب کا تعلق دوسری قسم کے جذبات کے ساتھ ہے۔ مذہب انسان کیلئے ایک ایسا نظامِ زندگی مہیا کرتا ہے جس سے جذبات کی انفرادی تسکین کی بجائے اسے کلی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ مذہب انسانی جذبات کو ختم نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی موزوں اور مناسب تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کی تمام اقدار پر حاوی ہے۔ مذہب زندگی کے تمام اعمال و افعال اور شعبوں میں ایک نظم پیدا کرتا ہے۔ انسانی زندگی ایک کل ہے اور اپنے مختلف شعبوں کے لئے ایک ہی قسم کے اصول کی متقاضی ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو انسانی زندگی کا توازن باقی نہ رہے۔ حیاتِ انسانی میں نظم اور توازن پیدا کرنے کے لئے مذہب دو کام کرتا ہے :۔

۱۔ مذہب زندگی کا ایک خاص نصب العین مقرر کرتا ہے جس سے ذہنی

انتشار و جمود ہو کر انسان کے افکار و نظریات میں ایک نظم و ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے تفصیلی ہدایات دیتا ہے جن کی روشنی میں انسان اپنی زندگی کے لئے قوانین وضع کر سکتا ہے۔

جذباتِ انسانی کی تسکین کامل کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ انسان اپنے جذبات کی تسکین میں ایک حیوان سے قطعی مختلف ہے۔ حیوان کی زندگی میں جو جذبات ابھرتے ہیں مثلاً بھوک، پیاس، نیند یا جنسی خواہش۔ وہ ان کی فوری تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر جذبہ ایک مستقل اکائی ہے، جس کا دوسرے جذبات کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ بخلاف ازیں انسان اپنے بعض جذبات کو اس لئے نظر انداز کر دیتا ہے کہ ان کی تسکین اس کی کلی زندگی میں بحیثیت مجموعی مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کے پیش نظر اس کی ذاتی تسکین ہی نہیں بلکہ خاندانی طمانیت بھی مدِ نظر ہے۔ ہر ایسا عمل جو اس کے خاندان کو فائدہ پہنچاتا ہے اس کے لئے باعث تسکین ہے اور جس سے اس کے خاندان کو فائدہ نہ پہنچتا ہو وہ اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ انسان کا یہ تصور خاندان کی حدود سے آگے بڑھ کر قوم، معاشرہ، دنیا اور پھر تمام کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اس کی ذات کی تسکین ایک ماورائی تسکین میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ انسان کو ایک ایسی ماورائی حقیقت سے ہمکنار کرتا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بندے کے سب کام رضائے الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ انسان ذاتی جہد و سعی سے اس مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ مذہب ایسی ہمہ گیر تسکین کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا اور سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ مذہب کے دامن میں پناہ لئے بغیر یہ سکون و اطمینان ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا

مادی وسائل کی فراوانی انسان کو فرعون و قارون تو بنا سکتی ہے مگر روحانی اطمینان کی دولت سے مالا مال کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

صحیح اور غلط مذہب میں تمیز

سوال ۳۳ :۔ ماننے اور جاننے میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کے پیش نظر اسلام کی صداقت واضح کیجئے۔

جواب :۔ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات انسان کی نگاہ میں صحیح ہو مدلل و جاں ہے اس کو تسلیم کر لیا جائے۔ مذہبی اصطلاح میں اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ جاننے سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی گہرائی میں اتر کر اس کی حقیقت و ماہیت کا کھوج لگانے کی کوشش کی جائے۔ سچے مذہب کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسانی فطرت میں اس مذہب کی تعلیمات کو ماننے اور ان پر ایمان لانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلیمات فطرتِ انسانی کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام ہمیشہ لوگوں کو دعوتِ ایمان دیتے رہے مگر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ انہیں ایمان کی بجائے ان باتوں کا کھوج لگانے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کیلئے کہا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان حقائق کے منکر ہو گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ جاننے اور ماننے میں بڑا فرق ہے۔ ہر دور میں انبیاءؑ کی مخالفت اس لئے نہیں کی جاتی تھی کہ وہ لوگ ان کے بیان کردہ حقائق کو مان نہیں سکتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کو جاننے یعنی ان کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ آجکل مذہب کے غیبی حقائق مثلاً جنت، دوزخ، فرشتے اور عذاب قبر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مذہب نے ان امور کو ماننے اور ایمان

لانے کا حکم دیا تھا مگر لوگ ان کو جاننے پر مصر ہیں اور جب جاننے کی قدرت اپنے میں نہیں پاتے تو ان سے انکار کر دیتے ہیں۔

دیگر مذاہب سے قطع نظر، اسلام کا ایک ایک مسئلہ حق و صداقت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ علمائے اسلام نے اسلامی افکار و عقائد کو میزانِ عقل میں تولنے کے لئے ایک خاص علم وضع کیا ہے جس کا نام ہے "علم الکلام"۔ علم الکلام میں اسلام کے ہر اصول مسئلہ کے بارے میں ثبت کیا جاتا ہے کہ وہ انسانی عقل و فطرت سے کامل طور پر ہم آہنگ ہے۔ علم الکلام کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

۱۔ دین اسلام کے افکار و آراء ان سوالات کا صحیح جواب ہیں جو فطرتِ انسانی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ علم الکلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ فطرتِ انسانی میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب حواس و عقل سے دینا ممکن نہیں اور ان کا تسلی بخش حل تلاش کرنے کیلئے حواس کے علاوہ ایک اور ذریعہ کی ضرورت ہے جسے مذہبی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔

۳۔ وحی اور نبوت کے ذریعہ جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ عقل و فطرت کے بالکل مقابل ہوتا ہے۔ ہم ان سوالات کے جوابات کو مان تو سکتے ہیں مگر جان نہیں سکتے۔ کسی مذہب کے متعلق اطمینان حاصل کرنے کے لئے یہی روشن ترین عقل و قیاس ہے۔

سوال ۳۲ :۔ معرفت کیا چیز ہے؟ دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے

جواب :۔ صوفیا کا قول ہے کہ جو لوگ اسلامی عقائد و افکار

کو مان لینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی حقیقت بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو وحی و نبوت کی معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حواس خمسہ اور عقل کے علاوہ ہر انسان میں کچھ علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں۔ قرآنِ حکیم نے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ انبیائے کرام کی کامل اطاعت سے یہ خوابیدہ صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ یہ مقام حاصل ہونے سے قبل انسان اسلامی عقائد و افکار کو صرف مانتا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کو پہچاننے لگتا ہے۔ جو شخص اس سعادت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اسے مذہبی حقائق کی معرفت و شناخت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اسی علم کو "معرفت" کہتے ہیں۔ معرفت کے معنی ہیں پہچاننا۔ شناخت و پہچان کا تعلق ان ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کا علم پہلے حاصل ہو۔ پھر اس میں مزید ترقی ہو کر ان کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جائے۔ مولانا رومؒ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن ‏ جانِ خود را جانبِ دلدار کن!
صیقلے کن یک دو روزے سینہ را ‏ دفترے خود ساز آں آئینہ را

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا : (جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں انہیں ہم اپنی راہیں دکھاتے ہیں)

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کی اطاعت سے آدمی اپنی آنکھوں سے غیبی حقائق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ اور مقامِ قال سے گذر کر مقامِ حال پر فائز ہوتا ہے مگر یہ مقامِ بلند اہلِ دل اور اربابِ ایمان کی صحبت و رفاقت سے حاصل ہوتا ہے۔

اب یہ مسئلہ باقی رہا کہ معرفت اور علم الکلام میں کیا فرق ہے؟ یہ امر پیش نظر رہے کہ اسلامی اصول و عقائد کو علم و عقل کے طریقہ سے ثابت کرنے کا نام علم الکلام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سچے اور جھوٹے مذہب میں فرق و امتیاز کا ایک طریقہ تو معرفت (پہچان) ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مذہبی حقائق کو علم و عقل اور فطری تقاضوں کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے یہ راستہ بھی خاصا کٹھن ہے۔ مذہب کے ایک ایک مسئلہ کو لے کر اسے فطرتِ انسانی پر پیش کرنا اور پھر اس پر بحث و تحمیص کرنا کارے دارد والی بات ہے اور ہر شخص اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اہل تحقیق نے فرداً فرداً ان دونوں راستوں کو اختیار کرنے کی بجائے ان کے اختلاط سے ایک معجونِ مرکب تیار کیا۔ انہوں نے معرفت اور کلام دونوں کو یکجا کر کے یہ ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و اصول عقل انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ پھر اپنے آپ کو سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت و سوانح اور اخلاق و آداب کے سانچہ میں ڈھالا۔ یہ لوگ اپنے عمل و اخلاق اور عقل و علم سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ تبلیغِ اسلام کا یہ طریق بہت مقبول ہوا۔ اس میں نہ تو معرفت و ریاضت کی کٹھن منزلیں ہیں اور نہ ہی علم الکلام کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اشاعت اسلام کا یہ طریقہ بے حد موثر ہے۔ اس لئے کہ اس میں عقلی اطمینان کے پہلو بہ پہلو دل کی دنیا بھی شاد و آباد ہو جاتی ہے۔ اولیاء و صلحاء ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہے۔

جو لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مذہب کی بنیاد روایت پرستی اور خوش اعتقادی پر رکھی گئی ہے علم الکلام کے مطالعہ سے ان کی غلط فہمی

ہوتی ہے۔ اس علم کے مطالعہ سے عقل و دانش کی راہیں کھلتی ہیں اور آدمی
روایت پرستی کا اسیر ہونے کی بجائے وسیع البصیرت اسلامی حقائق کو پرکھنے
اور جانچنے لگتا ہے۔ جو لوگ یہ رٹ لگاتے ہیں کہ مذہبی لوگ احمق ہوتے
ہیں۔ علم الکلام کا مطالعہ کرکے اپنی غلطی پر نادم ہوتے اور یہ سمجھنے لگتے ہیں
کہ ایسے دین صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جنہوں نے اپنی عقل و بصیرت کو
کھو دیا اور ملحدانہ زندگی بسر کرکے اپنے فطری جذبات کو پامال کر ڈالا۔

مذاہب عالم

ایک تقابلی مطالعہ

مذہب کی تعریف

سوال ۳۵:- مختصر الفاظ میں بتائیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ نیز مذہب کے ارتقاء کی تفصیلات مختصراً بیان کیجئے۔

جواب:- چونکہ دنیا میں لاتعداد مذہب پائے جاتے ہیں اور ان میں بیان کردہ عقائد و اعمال بھی مختلف ہیں۔ اس لئے مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ مسٹر ای۔ بی ٹیلر نے مختصر ترین الفاظ میں مذہب کی تعریف یہ بیان کی ہے۔

"مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے۔"

اس تعریف سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مذاہب عالم کا جوہر و خلاصہ کیا ہے مگر وہ مذہب اس تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں جن میں ایمان و عقیدہ پر چنداں زور نہیں دیا گیا بلکہ اخلاقیات کو مذہب کی روح قرار دیا گیا ہے مثلاً بدھ مذہب اور کنفیوشس کا مذہب یہی وجہ ہے کہ اس تعریف کو ناکافی سمجھتے ہوئے مسٹر میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو "جذباتی اخلاق" سے تعبیر کیا ہے یعنی اخلاق کا وہ مجموعہ جو جذبات کے زیر اثر تربیت پاتا ہے اسے مذہب کہا جاتا ہے۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے مذہب کی یہ تعریف کی ہے۔

"مذہب ان صداقتوں کے مجموعہ کا نام ہے کہ اگر انہیں خلوص سے قبول کیا جائے اور عقل و خرد کی روشنی میں سمجھا جائے تو انسانی زندگی میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے"

مذہب کا ارتقاء

مذہب کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں

۱۔ پہلا وہ نظریہ جو مذہب نے پیش کیا ہے۔ اسے مذہبی نقطۂ نگاہ کہتے ہیں

۲۔ ارتقائی نظریہ

۱۔ اس ضمن میں مذہبی زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کائناتِ ارضی پر بھیجا تو اس کی جسمانی ضروریات کے اہتمام کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی غذا کا بھی سامان کیا۔ پہلا شخص جسے خدا نے زمین پر بھیجا (حضرت آدمؑ) پہلا پیغمبر بھی تھا۔ اس کے بعد جب بھی دنیا میں جہالت و ضلالت پھیلنے لگی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر لوگوں کو صراطِ مستقیم سے آگاہ کیا۔ سب سے آخر میں سالارِ رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری اور مکمل دین دے کر مبعوث کیا۔ سب انبیاء دینِ اسلام کے داعی و مبلغ تھے اس لئے اصولِ دین یکساں تھے البتہ ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے انبیاء کی تعلیمات میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ جب کوئی قوم امتدادِ زمانہ سے اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو بگاڑ دیتی تو اس کی اصلاح کے لئے نئے پیغمبر کو بھیجا جاتا تھا۔ مسیحیت اور یہودیت جن کی نسبت حضرات عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کی طرف ہے اصولی طور پر اسلام ہی تھیں۔ ان کے پیروؤں نے اصلی تعلیمات کو مسخ کر ڈالا۔ لہٰذا اب ان کی وہ اصلی صورت باقی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان تعلیمات کو نازل کیا تھا۔ اب مذہب حق صرف دینِ اسلام ہے۔ اس کی تعلیمات معیارِ صداقت ہیں۔ سابقہ مذاہب و کتب کی جو باتیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں وہ درست ہیں۔ باقی

نہیں۔ یہ دین اپنی آخری شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے اور اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا پہلا عقیدہ توحید تھا۔ پھر انسانوں نے جادۂ توحید سے برگشتہ ہو کر شرک کو اختیار کر لیا۔ خدا کے نبی انسانوں کو شرک سے روکتے اور توحید کا سبق دیتے رہے۔

۲۔ مذہب کے بارے میں ارتقائی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انسان پہلے جاہل اور گمراہ تھا۔ آباؤ اجداد کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ مشرک بن گیا۔ توحید کا عقیدہ شرک کے ردِ عمل کے طور سے معرضِ وجود میں آیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان جب پیدا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو مظاہر قدرت میں گھرا ہوا پایا ہر طرف مظاہر قدرت مثلاً چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، سمندر، درخت، طوفان اور بجلی وغیرہ کی بھرمار تھی۔ انسان نے ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس و بےکس دیکھ کر ان کی پرستش شروع کر دی کیونکہ انسان کی موت و حیات کا انحصار انہی مظاہر فطرت، مثلاً زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں اور آتش فشانیوں پر تھا جب انسان کے علم میں اضافہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ مظاہر فطرت میں خدائی قوتیں نہیں پائی جاتیں۔ آغازِ کار میں ہر چیز کو دیوتا بنا لیا گیا تھا۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ دیوتاؤں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا۔ اس نظریہ کے مطابق انسان میں پہلے شرک پایا جاتا تھا۔ توحید کا عقیدہ شرک کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا۔

مذہب کے بارے میں یہ دونوں نظریات پہلے سے چلے آ رہے ہیں دورِ حاضر کے مغربی محققین اب ارتقائی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر مذہبی نظریہ کو اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مذاہب عالم کا مشہور ماہر پروفیسر شمٹ (SCHMIDT) اپنی کتاب "مذہب کی ابتداء و ارتقاء" میں لکھتا ہے۔

"اب یہ حقیقت نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ انسان کا ابتدائی مذہب عقیدۂ توحید تھا۔ اسی سے آخر کار ایک توحیدی دین نے جنم لیا۔" (ص ۲۶۲)
صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ دنیا میں کس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں ؛ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مذاہب ضرور موجود ہیں۔ ان میں سے بعض مذاہب کے پیرو کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور بعض کے کم ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے مذاہب ہندومت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام ہیں۔

سوال ۳۶ :۔ ہندو مذہب کی مختصر تاریخ، اس کی مذہبی کتب اور اس کے افکار و عقائد پر روشنی ڈالیئے۔

جواب :۔ ہندو مذہب کی تاریخ اور ان کے افکار و عقائد پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ خود ہندو مذہب کے حامل بھی اس کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے۔ اس مذہب میں خدا پرست سے لے کر تیس کروڑ تک خداؤں کے ماننے والے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ بلکہ متناقض عقائد رکھتے ہیں۔ عقائد و افکار کی گوناگونی سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں نے مختلف گروہوں کو اپنے اندر شامل کر لیا اور اس طرح اپنی تعداد بڑھالی ہے۔
ہندو مذہب بہت پرانا ہے اور اس کی تاریخ بھی معلوم نہیں۔ عام خیال ہے کہ ہندومت کا آغاز اس وقت ہوا جب تقریباً ۱۵۰۰ قبل از مسیح میں آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ آریاؤں سے پہلے یہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے جن کی تہذیب کے نشانات موہن جوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا وغیرہ میں کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ آریاؤں نے ان لوگوں کو

ترتیغ کر دیا یا محکوم بنا لیا۔ تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ویدوں کی تصنیف عمل میں آئی۔ ان میں ترکِ دنیا کی تعلیم دی گئی ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز پیدا ہوا اور ان کے چار طبقے قرار پائے۔ ان میں سب سے بہتر برہمن اور سب سے کمتر شودر سمجھے گئے۔ اس ذات پات کی بنیاد پیدائش ہے۔ جو شخص برہمن پیدا ہوا وہ خواہ کتنے ہی خراب کام کرے برہمن ہی رہے گا۔ اس لئے کہ برہما (خالقِ کائنات) نے اسے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ برہما نے کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے، ویشوں کو اپنے شکم سے اور شودروں کو اپنے قدموں سے پیدا کیا ہے۔ جو جو کام ان ذاتوں کو سونپے گئے اس میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا۔ برہمنوں کا کام پوجا پاٹ اور وعظ و نصیحت ہے۔ کھشتریوں کا جنگ اور حکمرانی۔ ویشوں کا کھیتی باڑی اور تجارت۔ شودروں کا کام خدمت گزاری ہے۔

ان ذاتوں کا لحاظ اتنا ضروری سمجھا گیا کہ آپس میں شادی بیاہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اچھوتوں کو اس حد تک ناپاک تصور کیا جاتا تھا کہ اونچی ذات کے لوگ ان کے سایہ سے بھی ناپاک ہو جاتے۔ اچھوت اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے جس سے اونچی ذات کے لوگ پانی پیتے ہوں۔ ان کے برتنوں میں کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے مندروں میں پوجا پاٹ کے لئے نہیں جا سکتے تھے۔ بعض ہندو لیڈر مثلاً مسٹر گاندھی نے چھوت چھات کی سخت مخالفت کی مگر ذات پات کے امتیاز کو مٹا نہ سکے۔

ہندو مذہب کی کتبِ مقدسہ

ہندو مذہب کی چار کتابیں مشہور ہیں۔ رگ وید[1]، اتھر وید[2]، شام وید[3]، یجر وید[4]۔ ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کی مشہور کتابیں اپنشد ہیں جن کا زمانہ

تصنیف تقریباً ۸۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کتب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی رُوح کارفرما ہے جسے "برہما" کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں تناسخِ ارواح (آواگون) کے عقیدہ پر زور دیا گیا ہے۔ آواگون کے عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ انسانی رُوح اپنے اعمال کے مطابق اچھے یا بُرے جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اسے جُونی چکر کہا جاتا ہے۔ یہ چکر عرصہ دراز تک قائم رہتا ہے۔ جزا، سزا اسی جونی چکر کے ذریعہ دی جاتی ہے لہذا قیامت کے برپا ہونے یا اخروی ثواب و عتاب کا مسئلہ خارج از بحث ہے۔ اگر ایک جنم میں نیک اعمال انجام دیئے جائیں تو رُوح دوسرے جنم میں کوئی اچھا جسم اختیار کر لیتی ہے ورنہ کسی بُرے جسم میں داخل ہو کر اپنے اعمال کی سزا پاتی ہے۔ جو شخص چوری کرتا ہے اسے یہ سزا دی جاتی ہے کہ اگلے جنم میں وہ چوہا بن کر پیدا ہوتا ہے۔ قاتل اگلے جنم میں شیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تناسخِ ارواح کا عقیدہ بڑا پرانا ہے اور آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں موجود تھا۔ مندرجہ بالا دو کتب کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتب میں سب سے اہم مہابھارت اور رامائن ہیں۔ ان کے علاوہ پران، منوسمرتی اور گیتا بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ مہابھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دُنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ رامائن میں ہندوؤں کے اوتار رام چندر جی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مہابھارت اور رامائن قدیم رجزیہ مثنویاں ہیں۔

ہندومت کے افکار و عقائد

ہندو مذہب میں ترکِ دنیا اور عیش و راحت سے احتراز کو روحانی

ترقی کی معراج خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سادھو جنگلوں میں بسیرا اختیار کر لیتے ہیں اور وہاں عبادت و ریاضت کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے اپنے جسم کو دکھ پہنچاتے ہیں مثلاً پانی میں کھڑے رہنا، انگاروں پر چلنا اور سخت دھوپ یا سردی میں بیٹھے رہنا۔

ہندو مت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی دنیا سے کنارہ کش نہ ہو۔ مگر اس صورت میں وہ روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔

۱۔ طلب علم کا دور
۲۔ خانگی زندگی کا زمانہ
۳۔ غور و فکر کی منزل
۴۔ پوجا پاٹ کا زمانہ

ہندو مذہب میں لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ برھما:۔

یہ خالق کائنات ہے مگر دنیا کو پیدا کر کے وہ بے کار ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شاذ و نادر ہی اس کی پوجا کرتے ہیں۔

۲۔ وشنو:۔

ہندوؤں کے نزدیک انسان کی زندگی و بقا اسی دیوتا سے وابستہ ہے برہما کا تعلق تو صرف پیدا کرنے کے ساتھ ہے لیکن وشنو کا تعلق دائمی ہے بعض اوقات یہ انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے رہنما مثلاً رام اور کرشن وشنو ہی کا اوتار تھے یعنی وشنو ان کی صورت میں

جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے یہاں وشنو کی بہت پوجا کی جاتی ہے اور اسے بھگوان اور لائق عبادت تصور کیا جاتا ہے۔

۳۔ شیوجی :۔

شیوجی کا کام انسانی زندگی کو ختم کرنا ہے۔ اس کا کام وشنو کے عین برعکس ہے۔ اس طرح عملی زندگی پر گویا وشنو اور شیوجی کی حکمرانی ہے۔ ہندو شیوجی کی بھی پوجا کرتے ہیں۔

اس وقت اچھوتوں کو شامل کر کے ہندوؤں کی تعداد ۲۷ کروڑ ہے یہ ہندوستان، پاکستان، برما، سیام، ملایا اور انڈونیشیا میں آباد ہیں

بُدھ مت

سوال ۲۷:۔ بدھ مت کی ابتداء اور ارتقاء اور اس کے افکار و عقائد پر تبصرہ کیجئے۔

جواب:۔ بدھ مت کی تحریک دراصل ہندو مذہب کی برہمنیت اور ذات پات کی تفریق کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر معرض وجود میں آئی اس مذہب میں کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری کی نفی کی گئی تھی اس لئے یہ شروع میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ مگر زیادہ دیر تک یہ نظریات اس میں باقی نہ رہے اور آخر کار یہ مذہب بھی ہندو مت کی طرح برہمنی تصورات سے آلودہ ہو گیا۔

گوتم بُدھ:۔

بدھ مت کا آغاز چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کے بانی گوتم بدھ ہیں جن کا اصلی نام ساکھیامنی تھا۔ نیپال کے جنوب میں کپل وستو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ناز و نعم میں گزری۔ ان کی ولادت کے وقت ایک نجومی نے کہا تھا کہ اگر اس بچے نے دنیوی مصائب کو بچشمِ خود دیکھ لیا تو تارک الدنیا ہو جائے گا ورنہ عظیم بادشاہ بنے گا۔ ان کے والد نے بڑا اہتمام کیا کہ یہ نومولود آلامِ روزگار سے ناآشنا رہے مگر اس کی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ گوتم بدھ ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ساتھ باہر گئے اور چند ایسے واقعات دیکھے جنہوں نے ان کی زندگی یکسر بدل دی۔ انہوں نے ایک بوڑھا، ایک مریض اور

ایک لاش دیکھی۔ ان غم افزا مناظر نے ان پر بہت اثر ڈالا۔ پھر ایک تارک الدنیا درویش کو دیکھا جس کے چہرہ پر سکون و اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

یہ دیکھ کر وہ ترکِ دنیا کے لئے تیار ہو گئے۔ آخر تیس ۲۹ سال کی عمر میں ایک رات بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ پہلے علم حاصل کرتے رہے پھر ریاضت شروع کر دی۔ غذا کو چند دانوں تک محدود کر دیا۔ سات دن تک مسلسل ایک درخت کے نیچے محو عبادت رہے۔ اس کے بعد انہیں اچانک وہ کیفیت حاصل ہوئی جسے "عرفان" کہتے ہیں جس جگہ انہیں یہ عرفان حاصل ہوا تھا اسے "بدھ گیا" کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے باقی زندگی تبلیغ و اشاعت میں بسر کر دی۔ ۴۸۰ سنہ قبل مسیح میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

افکار و عقائد :۔

بدھ مت کی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ بدھ مت میں خدا کے اثبات و انکار کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا

۲۔ اس میں فرشتوں کے وجود یا قیام قیامت کا کوئی ذکر نہیں ملتا

۳۔ گوتم بدھ کا قول ہے کہ اپنی زندگی کی بہتری کے لئے انسان کو کسی ماورائی طاقت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہر شخص عبادت و ریاضت کر کے اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے اور "نروان" حاصل کر سکتا ہے۔ نروان سے مراد روحانی ترقی کا وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر انسان دنیوی افکار و آلام سے نجات حاصل کر لیتا ہے

۵ بدھ مت میں آٹھ چیزوں کی صحت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱- صحیح ارادہ ۔۔۔ ۲- صحیح ایمان
۳- صحیح گفتگو ۔۔۔ ۴- صحیح کردار
۵- صحیح معاشش ۔۔۔ ۶- صحیح فکر
۷- صحیح انکسار ۔۔۔ ۸- صحیح مراقبہ

۶- بدھ مت میں پانچ چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔
۱- کسی جاندار کی جان نہ لی جائے۔
۲- کوئی چیز دھوکے یا زبردستی سے نہ لی جائے۔
۳- جھوٹ نہ بولا جائے۔
۴- نشہ آور چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔
۵- جسمانی گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔

۷- گوتم بدھ کے زمانہ میں یا تو ہندو یوگی تھے جو تارک الدنیا ہو کر درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے یا امراء تھے جنہوں نے ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی تھی۔ وہ ہر قسم کے عیش و راحت کے دلدادہ تھے گوتم بدھ نے ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔

بدھ مت میں انسان کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملتی۔ یہ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ضابطۂ اخلاق ہے جس میں روحانی تسکین و طمانیت کا سامان موجود ہے

مہایان اور ہنایان

بدھ مت کے ابتدائی دور میں بت پرستی نہ تھی۔ ابتدائی تصویروں میں مہاتما بدھ کو کسی نشان مثلاً کھڑاؤں یا خالی تخت سے ظاہر کر کے ان کی موجودگی کا تصور پیدا کیا جاتا تھا۔ بدھ مت کا یہ دور "ہنایان" کہلاتا ہے۔ اس کے معنی

کم بوجھ برداشت کرنے والے کے ہیں۔ آگے چل کر ہندو مت کے زیر اثر بدھ مت میں نئے نئے عقیدے اور رسم و رواج داخل ہو گئے۔ یہ ترمیم شدہ مذہب "مہایان" کہلایا۔ اس کے معنی ہیں "زیادہ بوجھ اٹھانے والا"۔ یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس میں ابتدائی مذہب کی نسبت بہت سے عقیدوں اور رسموں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔

بدھ مت کی نشر و اشاعت

بدھ مت، چونکہ برہمنیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج کے طور پر عالم وجود میں آیا تھا اس لئے انسانیت کے پامالی نظریات سے آلودہ ہو گیا اور گوتم بدھ کی بہت سی تعلیمات خارج کر دی گئیں۔ بدھ مت کے پیرو بت پرستی کرنے لگے۔ دراصل لفظ "بدھ" کی بگڑی ہوئی شکل بت ہے۔

مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو بڑا فروغ دیا۔ اس نے بیرونی ممالک میں مبلغ بھیجے۔ عبادت خانے تعمیر کئے اور جگہ جگہ کتبے نصب کروا کر بدھ مت کی تعلیمات کو پھیلایا۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ارض ہند بدھ مت کی جنم بھومی ہے مگر بدھوں کی تعداد یہاں بے حد قلیل ہے۔ بدھ مت کے پیرو زیادہ تر ممالک دیگر میں بود و باش رکھتے ہیں۔ بدھ مت کے پیرووں کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہ چین، برما، سیام، نیپال، بھوٹان اور سیلون وغیرہ میں آباد ہیں۔ بدھ مت کے پیرو پاکستان میں بھی سکونت پذیر ہیں۔

یہودیت

سوال ۳۸:۔ یہودیت کی مختصر تاریخ اور اس کے خصوصی خدوخال قلمبند کیجئے۔

جواب:۔ یہود کو نسلی اعتبار سے بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اسرائیل کے معنی ہیں "خدا کا بندہ" اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کو حضرت یعقوبؑ کے بیٹے یہودا کی نسبت سے یہودی کہا جاتا ہے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ انہیں تقرب ربانی حاصل ہے۔ اور وہ اس کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہیں قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بنی اسرائیل کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ۔	اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دیں نیز یہ کہ میں نے تمہیں ساری دنیا پر فضیلت بخشی

اس فضیلت کی وجہ بنی اسرائیل کی نسلی برتری نہ تھی بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دعوتِ اسلام کی نشرواشاعت کے لئے منتخب کیا تھا۔ جب بنی اسرائیل اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو ان کو اس فضیلت سے محروم کر دیا۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ ہی میں مصر آ گئے تھے۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ قبطیوں کی نسل آباد تھی۔ بنی اسرائیل

جب دعوت و ارشاد سے قاصر رہے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنا لیا۔ اسی دور انحطاط میں موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیرہ صدیاں قبل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے قبطیوں کی غلامی سے نجات پائی اور مصر سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ گھومتے پھرتے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس سلطنت کا رقبہ اگرچہ زیادہ نہ تھا مگر یہ ہر لحاظ سے فائق اور بہت دولتمند تھی۔

یہود کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے۔ جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی انہیں زوال ہوا۔ پھر ان میں پیغمبر مبعوث اور انہوں نے ان کو ذلت سے نجات دی۔ ان میں حضرت داؤد و سلیمان علیہا السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو بیک وقت بادشاہ بھی تھے اور نبی بھی۔ ان کے عہد رسالت میں بنی اسرائیل کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ جب بنی اسرائیل پھر بھی نافرمانیوں سے باز نہ آئے تو خدا نے ایسے فاتحین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اب موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے انہیں فلسطین میں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہود کے افکار و معتقدات :-

تمام الہامی مذاہب توحید کے قائل ہیں۔ آگے چل کر جب انہوں نے اپنے اپنے مذہب میں ترمیم و اضافہ سے کام لیا تو توحید کا عقیدہ کمزور پڑ گیا عیسائیت میں توحید کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا تھا لیکن بعد میں تثلیث نے توحید کی جگہ لے لی۔ آجکل اسلام کے علاوہ صرف یہودیت میں توحید

کی تعلیم ملتی ہے۔ تاہم یہودیت کی تعلیمات میں ایسی چیزیں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے یہود کے یہاں بھی آجکل توحید خالص نہیں ملتی۔ جہاں تک یہودیوں کے عقائد کا تعلق ہے ایک یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون نے ان کی تفصیلات یوں بیان کی ہیں۔

۱۔ خدا کے وجود پر ایمان
۲۔ توحید خداوندی پر ایمان
۳۔ خدا کے ابدی و دائمی ہونے پر ایمان
۴۔ خدا کے مادہ سے پاک ہونے پر ایمان
۵۔ عبادت صرف خدا کی کرنی چاہیئے
۶۔ رسالت پر ایمان
۷۔ حضرت موسیٰ کے رسول اعظم ہونے پر ایمان
۸۔ توریت کے وحی الٰہی ہونے پر ایمان
۹۔ تورات کے ناقابل تغیر ہونے پر ایمان
۱۰۔ خدا کے علیم و خبیر ہونے پر ایمان
۱۱۔ یوم آخر اور جزا و سزا پر ایمان
۱۲۔ مسیح کے آنے پر ایمان
۱۳۔ حشر و نشر پر ایمان

سبت کا دن

اللہ تعالیٰ نے سبت کے دن کو عبادت کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ یہود کا مذہبی تہوار تھا۔ سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہو کر سنیچر کے دن ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ یہود نے اس دن کی عظمت کو حیلہ جوئی کر کے توڑا اور غضب الٰہی کے مستحق ٹھہرے تھے۔ آجکل صنعت یہود سبت کے دن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہود اس دن کو عبادت دعا کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

یہود کی کتب مقدسہ

یہودیوں کی مقدس کتاب تورات ہے۔ تورات بائبل کے شروع میں

پانچ کتابوں کی صورت میں درج ہے۔ اب تورات میں ان پانچ کتابوں کے علاوہ دوسرے نبیوں کے صحیفے اور تورات کی تفسیر تالمود بھی داخل ہے۔ تورات کا اصل نسخہ کہیں دستیاب نہیں۔ موجودہ مجموعے اس کے جلائے جانے کے صدیوں بعد لکھے گئے۔ تورات کی زبان اب مردہ ہو چکی ہے۔ موجودہ تورات میں لفظی و معنوی تغیرات بکثرت ہوئے ہیں۔ خاص طور پر تورات کے وہ حصے جن میں انبیاء مثلاً حضرت نوح، لوط اور یعقوب علیہم السلام پر بدترین الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ تورات آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اسے تختیوں پر کندہ کرایا گیا تھا۔ جس فاتح نے بھی یروشلم کو فتح کیا، ان تختیوں کو آگ لگا دی۔ یہود کوشش کے باوجود تورات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ چونکہ نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے اور تورات صرف یہود کے پاس تھی۔ لہٰذا انہوں نے تورات میں حسبِ خواہش تبدیلیاں کر ڈالیں۔

یہودیوں کی تعداد

چونکہ یہودیت نے الہامی مذہب کی بجائے ایک نسلی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی اس لئے ان کی تعداد تاریخ کے ہر دور میں بہت کم رہی۔ مزید برآں تاریخ کے بعض ادوار میں بنی اسرائیل کی نسل کو کرۂ ارضی سے مٹانے کا تہیہ کیا گیا اور بہت کم افراد فاتحین کی یلغار سے جانبر نہ ہو سکے۔ حضرات داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دورِ حکومت بنی اسرائیل کی تاریخ کا زریں عہد تھا مگر اس وقت بھی ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ تھی لیکن جرمنی میں ان کا قتلِ عام ہوا اور اب ان کی تعداد دنیا بھر میں ایک کروڑ سے زیادہ نہیں۔ بنی اسرائیل

آجکل زیادہ تر اسرائیل نامی سلطنت میں آباد ہیں۔ اسرائیل کا شجرۂ خبیثہ اہلِ مغرب کی یادگار ہے اور وہ اپنے ناپاک عزائم کے لیے اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔

عیسائیت

سوال ۳۹:۔ عیسائیت کی ابتداء ارتقاء اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر مختصر تبصرہ کیجئے؟

جواب:۔ عیسائیت کے پیروؤں کی تعداد تمام اہل مذاہب سے زیادہ ہے۔ دنیا میں اس وقت پچھتر کروڑ عیسائی آباد ہیں۔ یہ تعداد دنیا کی مجموعی آبادی کا تیس فیصد ہے۔ گویا کثرت تعداد کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہودیت کی طرح عیسائیت بھی ابراہیمی مذہب کی ایک شاخ ہے۔ یہودیت سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ پہلے عیسائیت کو یہودیت کی ایک شاخ تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا عیسائیت کو سمجھنے کے لئے یہودیت کی تاریخ سے آگاہ ہونا ضروری ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:۔

قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے قبل یہودی ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ سزا کے طور پر انہیں فلسطین کی حکومت سے دوبارہ محروم کر دیا گیا۔ ان میں مسلسل انبیائے کرام تشریف لاتے رہے لیکن ان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ انہوں نے بعض انبیاء کو قتل کیا۔ بعض کو قید و بند میں رکھا اور بعض کو سنگسار کر دیا۔ معاشرہ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ برائی کے خلاف کوئی آواز سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا یہ اس وقت کی حالت ہے جب یہودی فلسطین کی حکومت سے محروم ہو کر اپنے وطن میں رومیوں کے غلام ہونے کی حیثیت سے زندگی کے

دن کاٹ رہے تھے۔ مقامِ حیرت ہے کہ غلامی کی ذلت کے باوجود یہودیوں کی حالت میں ہرگز فرق نہ آیا۔ ان کے فقہا و علماء چھوٹے چھوٹے مسائل میں باہم وہیت دگر بیاں رہتے تھے۔ موسوی شریعت ایک بے روح ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی جس میں یہود نے اپنے حسبِ مرضی تغیر و تبدل قبول کر لیا تھا۔

اندریں حالات آج سے دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں بیت المقدس کے قریب بیت اللحم نامی جگہ میں کنواری مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریخ میں محفوظ نہیں ہیں۔ عام خیال ہے کہ آپ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور ۲۹ء میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ تیس سال کی عمر میں آپ نے دعوت و ارشاد کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے وعظ و نصیحت کی اور معجزات بھی دکھلائے۔ جن یہودی علماء نے دینِ موسوی کو حسبِ خواہش تبدیل کر لیا تھا حضرت عیسیٰؑ نے خاص طور پر ان کو ہدفِ ملامت بنایا۔ آپ کے ارشادات سے بہت کم لوگ متاثر ہوئے اور وہ بھی کم حیثیت کے لوگ تھے مثلاً ماہی گیر اور دھوبی وغیرہ۔ یہود کا با اثر طبقہ آپ کے خلاف تھا۔ یہودی علماء نے آپ پر بغاوت کا الزام عائد کیا اور یہودی گورنر سے سازش کر کے آپ کو گرفتار کروا دیا۔ آپ کے لیے صلیب کی سزا تجویز کی گئی۔ یہودی گورنر آپ کی بے گناہی کا معترف ہو چکا تھا اور آپ کو سزا دینے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے یہودیوں کو مشورہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور برابا ڈاکو میں سے ایک کو قومی تہوار کے موقع پر رہا کر دیا جائے۔ برابا ڈاکو وقت کا مشہور قاتل تھا اور پہلے بھی گرفتار کر کے سولی دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ یہودیوں نے برابا کو رہا کرنے

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنے کا فیصلہ صادر کیا۔ اس ضمن میں
قرآن کا بیان ہے کہ یہودی اپنے مقاصد میں ناکام رہے اور آپ کی ہم شکل و
صورت کے کسی اور شخص کو سولی پر چڑھا دیا۔ اس باب میں عیسائی یہ عقیدہ
رکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اپنے مقدس باپ خداوند کے اکلوتے بیٹے تھے۔
جن کا حمل روح مقدس سے ٹھہرا تھا اور جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا
ہوئے تھے۔ رومی گورنر نے آپ کو سولی پر لٹکایا اور آپ فوت ہو گئے
دفن کیے تیسرے روز آپ زندہ ہوئے۔ آسمان پر چڑھے اور اب اپنے
باپ خداوند کے دائیں طرف بیٹھے ہیں۔

**سوال نمبر ۳:۔ عیسائیوں کے افکار و معتقدات، ان کے
فرقوں اور کتب مقدسہ کی تفصیلات بیان کیجئے۔**

جواب:۔ عیسائیوں کے افکار و نظریات میں تثلیث (TRINITY)
کے عقیدہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے تاہم دلائل کی روشنی میں واضح ہوتا
ہے کہ ابتداء میں یہ متفق علیہ عقیدہ نہ تھا۔ ہمیں بہت سے فرقوں کا حال معلوم
ہے جو تثلیث کے قائل نہ تھے بلکہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بندہ مانتے تھے۔ نائسیہ
کے مقام پر شاہ قسطنطین اعظم نے جو مذہباً عیسائی ہو چکا تھا۔ عیسائی فرقوں
کے اختلاف کو مٹانے کے لیے تیسری صدی عیسوی میں ایک مذہبی کونسل
کا انعقاد کیا۔ کثرت رائے سے قرار پایا کہ تثلیث اور کفارہ کے مسئلہ کو مسیحیت
میں بنیادی حیثیت دی جائے مگر اختلاف کرنے والے اس سے متفق نہ ہو سکے۔
آگے چل کر تثلیث کے مسئلہ کو مسیحیت میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی
تثلیث کے معنی ہیں خدا کو تین ماننا۔ عیسائی عقیدہ کے مطابق خدا (باپ)

عیسٰی (بیٹا) اور روح القدس (جبرئیل فرشتہ) تین الگ الگ اکائیاں ہیں۔ لیکن ان تینوں سے مل کر ایک وحدت بنتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا ایک ہیں تین اور تین ہیں ایک ہے یعنی بیک وقت وہ ایک بھی ہے اور تین بھی۔ ان تینوں کا الگ مستقل وجود ہے۔ تینوں الگ الگ قادرِ مطلق اور خدا ہیں اور تینوں مل کر پھر ایک بن جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدۂ تثلیث خاصا گورکھ دھندا ہے مشہور عیسائی عالم چارلس اینڈرسن اسکاٹ لکھتا ہے

"ابتدائی تین اناجیل میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر یہ گمان کیا جاسکے کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے مسیح کو انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک ایسا انسان تھا جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یافتہ تھا۔ اناجیل کی متعدد عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے آپ کو صرف نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

کفارہ کا مسئلہ:-

عیسائیت کا دوسرا بڑا مسئلہ کفارہ (نجات) ہے۔ مسئلہ کفارہ کا حاصل یہ ہے کہ سب انسان گنہگار ہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔ جب سب کائنات گناہ میں مبتلا ہو گئی تو رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور خدا خود مریم کنواری کے بطن سے پیدا ہو کر ابن اللہ کہلایا اور انسانوں کے ہاتھوں دکھ اٹھا کر صلیب پر مر گیا تاکہ انسان گناہ سے نجات پائے۔ مسئلہ کفارہ کے مطابق نجات صرف اسی طریق سے ممکن ہے کہ مسیح کے خدا، ابن اللہ اور مصلوب ہونے پر ایمان لایا جائے۔ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہی نجات پائیں گے۔ عیسائی عقیدہ کفارہ کے مطابق حضرت مسیح کو نجات دہندہ مانتے ہیں۔ قرآن حکیم نے عقیدۂ تثلیث اور کفارہ دونوں کا ابطال کیا ہے

عیسائیوں کے فرقے :-

عیسائیوں کے بہت سے فرقے ہیں جن میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے ان میں دو فرقے زیادہ مشہور ہیں (۱) رومن کیتھولک (۲) پروٹسٹنٹ۔ یہ دونوں فرقے تثلیث اور کفارہ کے قائل ہیں۔ رومن کیتھولک کا مرکز روم ہے اور پوپ ان کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے جو مسیح کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ ہر ملک میں اس کے نائب مقرر ہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کا بانی لوتھر تھا جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب میں اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ "مشرقی تقلید پسندوں کا ایک اور بڑا عیسائی فرقہ بھی ہے جس کا مرکز روس ہے۔ یہ فرقہ پہلے دونوں فرقوں سے مختلف عقائد رکھتا ہے۔ کچھ عیسائی ایسے بھی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے بلکہ خدا کا بندہ اور نبی کہتے ہیں۔ مگر عام عیسائی ان کو اپنے مذہب میں شامل نہیں کرتے

عیسائیت کی نشر و اشاعت :-

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک مسیح آئے گا جو بنی اسرائیل کی رہنمائی کریگا جب حضرت عیسیٰؑ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو یہودیوں نے انکار کر دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیت نے بہت ترقی کی۔ چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں روم عیسائیت کا گہوارہ بن گیا۔ اس کے بعد عیسائیت کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قرونِ وسطیٰ میں پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

عیسائی چرچ

چرچ عبادت گاہ کو کہتے ہیں مگر اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو کے

مذہبی اداروں اور ان کے انتظام پر بھی چرچ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ سیاسی قوت، مذہبی اثر و رسوخ اور دولت کی ریل پیل نے چرچ کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا تھا مگر عیسائی رہنما اس کا غلط استعمال کرنے لگے۔ انہوں نے حضرت مسیح کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر شاہانہ ٹھاٹھ سے رہنا شروع کر دیا وہ دولت کے حصول کے لئے ہر طرح کے ذرائع استعمال کرنے لگے۔ اس کی حد یہ ہے کہ پوپ نے جنت کا ٹھیکے دار بن کر اس کے سرٹیفکیٹ فروخت کرنے شروع کر دیئے۔

وہ کفر و الحاد کا فتویٰ لگا کر جس کو چاہتا مروا دیتا۔ ذرا سا اختلاف اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اختلاف رائے رکھنے والوں کو ایک خاص عدالت میں پیش کیا جاتا تھا جسے احتسابی عدالت کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ان عدالتوں نے ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ایک خاص عدالت میں تقریباً تین لاکھ آدمیوں کو شدید سزائیں دیں۔ ان میں سے ۳۲ ہزار کو جلتی آگ میں جھونکا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گیلیلیو جیسے ماہرین سائنس بھی شامل تھے۔ اٹلی کے مشہور سائنسدان برونو کو بھی اشاعت علم کے جرم میں نذر آتش کر دیا گیا۔ چرچ کے اس ظالمانہ رویہ نے اس خیال کو جنم دیا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں اور مذہب کا عقل و استدلال سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے لوگوں میں دین و دنیا کی تفریق کا نظریہ پیدا ہوا اور مذہب کے معاملہ میں اندھی تقلید کو ضروری خیال کیا جانے لگا۔ ایک عیسائی دنیوی معاملات میں لاکھ ہوشیار ہو مگر مذہب کے بارے میں وہ اندھا مقلد ثابت ہوگا۔

عیسائیوں کی کتب مقدسہ

قرآن کریم کے بیان کے مطابق انجیل آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی۔ آج خطۂ ارضی پر انجیل کا کہیں وجود نہیں ہے۔ بائبل کو عیسائیوں کی مقدس کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ بائبل عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ قدیم میں تورات کی پانچ کتابوں کے علاوہ اور کئی نبیوں کے صحیفے اور کئی تاریخی کتابیں جمع ہیں۔ عہد نامہ جدید میں اناجیل اربعہ، حواریوں کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفات ہیں۔ اس مجموعہ کو عیسائی مقدس کتاب مانتے ہیں۔ اناجیل اربعہ یہ ہیں۔

۱۔ متی کی انجیل ۲۔ لوقا کی انجیل ۳۔ مرقس کی انجیل ۴۔ یوحنا کی انجیل

ان کے علاوہ اور اناجیل بھی موجود ہیں مگر ان کو معتبر نہیں سمجھا جاتا۔

اناجیل اربعہ میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کا شجرۂ نسب بھی یکساں نہیں ہے۔ عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ یہ اناجیل چار مصنفین کو علیحدہ علیحدہ القاء ہوئی تھیں۔ القاء ہونے کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے بہت بعد کا ہے اور پھر ان کو تحریر کرنے کا زمانہ القاء سے بہت متاخر ہے۔ تیسری صدی عیسوی تک عیسائیوں میں متعدد اناجیل اشاعت پذیر ہو چکی تھیں۔ اناجیل اربعہ کے مصنفین میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا حواری یا شاگرد نہیں ہے۔ اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے سیر و سوانح اور ان کے وعظ بھی درج ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواری برنباس نے جو انجیل مرتب کی تھی اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی پیشگوئی موجود ہے مگر عیسائی اس انجیل کو تسلیم نہیں کرتے۔

اِسلام

سوال ۱۱ :- دینِ اسلام کی حقیقت اور اس کی ابتداء پر نوٹ لکھیئے ؟

جواب :- اسلام وہ سچا دین ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کیلئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ سلسلہ اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور سید الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دینِ اسلام کی تکمیل ہو گئی اور اب کسی نئے رسول یا نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ اسلام کا آغاز ہوا۔ اسی بنا پر وہ آپؐ کو بانیٔ اسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں خدا نے جس قدر انبیاء بھیجے وہ سب دینِ اسلام ہی کے داعی تھے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب مسلم تھے لیکن بعد میں ان کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو تبدیل کر دیا۔ عیسائیت اور یہودیت بھی اسلام ہی کی تبدیل شدہ صورت ہیں۔

دینِ اسلام کی حقیقت

اسلام کے لفظی معنی ہیں "گردن نہادن" (سر نیاز خم کرنا) گویا اسلام خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز دانستہ یا نادانستہ خدا کے قانون کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے اور اس اعتبار سے مسلم ہے انسان بھی بڑی حد تک خداوندی قانون کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کا جسم

اس کا ذہن، اس کے جذبات و احساسات سب قوانین خداوندی کے ماتحت ہیں لیکن انسانی زندگی کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو خدا نے انسان کے ارادے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ اپنی اس شعوری اور ارادی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہونے کا فیصلہ کریں انہیں "مسلم" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلم کسی خاندان یا ذات کا نام نہیں بلکہ ایک نظریۂ حیات کا نام ہے۔

عقائد و اعمال:۔

اسلامی عقائد میں تین امور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

۱۔ توحید۔ ۲۔ رسالت۔ ۳۔ تصور آخرت

توحید:۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کے سوا کسی کو اطاعت و عبادت کے لائق نہ سمجھے۔

رسالت:۔ رسالت کے معنی ہیں کہ جن انبیاء نے ہم تک خدا کا پیغام پہنچایا ان کو رسول دینی تسلیم کیا جائے۔

آخرت:۔ عقیدۂ آخرت سے مراد یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب سب انسانوں کو زندہ کیا جائے گا اور ان کو ان کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی۔ آخری زندگی ابدی اور پائیدار ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیوی زندگی فانی اور زوال پذیر ہے۔

اسلام جن اعمال کا مطالبہ کرتا ہے ان میں پانچ مطالبات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ پانچ وقت کی نماز۔ ۲۔ ماہ رمضان کے روزے۔ ۳۔ عمر بھر میں ایک دفعہ حج کرنا۔ ۴۔ سالانہ زکوٰۃ۔ ۵۔ جہاد فی سبیل اللہ

مسلمانوں کی تعداد :-

اس وقت دنیا بھر میں ۵۲ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ مسلمان دنیا کے ہر گوشہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت اقوام متحدہ کے ۱۴۰ ممبر ملکوں میں سے ۳۴ مسلم ممالک ہیں۔ بیسویں صدی میں حصولِ آزادی کیلئے سب سے زیادہ جدوجہد مسلمانوں ہی نے کی ہے۔ اسی جدوسعی کا نتیجہ ہے کہ دورِ حاضر میں ۳۴ آزاد مسلم ممالک کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔

ایک تقابلی مطالعہ

سوال ۴۲:۔ اسلام اور دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ کا مقابلہ کیجئے اور بتائیے کہ ان میں افضل کونسی کتاب ہے اور کیوں؟

جواب:۔ ہم قبل ازیں مشہور مذاہب کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اب یہ دیکھیں گے کہ مذکورہ مذاہب میں سے کس مذہب کی کتاب فی الواقع آسمانی ہے اور زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کی مقدس کتاب کا تعلق ہے۔ آج تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ وید کس زمانہ کی تصنیف ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ ہندو ویدوں کو صحیح نہیں سمجھتے اور ان کو آسمانی کتاب کی بجائے انسانوں کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ گوتم بدھ نے کوئی کتاب یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کی تعلیمات سینہ بسینہ چلتی رہیں اور مدت کے بعد کتابی صورت میں جمع کی گئیں۔ یہودیوں کی مقدس کتاب تورات کے بارے میں تاریخی شہادت سے ثابت ہے کہ یہ کتاب عرصۂ دراز تک ناپید کر دی گئی تھی اور صفحۂ ارض پر اس کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو ہیکل سلیمانی کو تہس نہس کر دیا اور تورات کا صرف ایک نسخہ جو وہاں موجود تھا جل کر راکھ ہو گیا۔ بخت نصر پوری یہودی قوم کو پکڑ کر اپنے ساتھ بابل لے گیا جہاں انہیں اپنی مذہبی رسموں کے بجا لانے کی اجازت نہ تھی۔

ایران کے بادشاہ سائرس نے جب بابل فتح کر کے یہودیوں کو رہائی

دلائی تو انھوں نے کہیں سے تورات کا ایک نسخہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے بعد کم از کم تین مرتبہ تورات کے نشان کو صفحہ ہستی سے مٹایا گیا۔

اندریں حالات یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تورات وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ تورات کے محرّف ہونے کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں انبیاء کی توہین کی گئی ہے۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین و تکفین تک کے واقعات درج ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کے مصنفین نے حضرت موسیٰؑ کے بہت بعد اسے تصنیف کیا۔ اور اس میں ان کے سیر و سوانح بھی درج کر دیئے۔

انجیل :-

انجیل کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نامی جو کتاب اتاری گئی تھی اس کا کہیں وجود نہیں۔ حضرت مسیح کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ بائبل کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس زمانہ میں جو انجیلیں لکھی گئیں ان کی تعداد ۴۰ تک بیان کی جاتی ہے۔ حواریوں کے بہت سے خطوط کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ۳۲۵ء میں نیقہ کے مقام پر ایک کونسل کے سامنے ان اناجیل کو پیش کیا گیا۔ انھوں نے ان میں سے مندرجہ ذیل چار انجیلوں کو صحیح قرار دیا۔

۱۔ متی کی انجیل۔ ۲۔ لوقا کی انجیل۔ ۳۔ مرقس کی انجیل۔ ۴۔ یوحنا کی انجیل۔

ان کے علاوہ باقی تمام انجیلیں بیکار سمجھی گئیں۔ یہ انجیل چوتھی یا پانچویں

...ندی کی جو انجیل دستیاب ہے وہ یونانی زبان میں ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح اور
...ان کے حواریوں کی زبان آرامی تھی۔ اناجیل کے مصنفین کے بارے میں عیسائی بھی
...لف الخیال ہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح کے حواریوں کے
...گرد تھے۔ انہوں نے اپنے علم کی حد تک حضرت مسیح کی سوانح عمریاں مرتب کی
...یں۔ عیسائیوں نے ان کو الہامی کتاب قرار دیدیا۔

قرآن کریم

دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ کے برخلاف قرآن کریم اپنی اصلی زبان (عربی)
...آج تک اسی طرح موجود ہے جس طرح اترا تھا۔ اس کی زبان ایک زندہ زبان
...ے جو کرۂ ارضی پر ہر جگہ بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
...عین حیات ہی قرآن کریم مرتب ہو گیا تھا۔ خلافت راشدہ میں صحابۂ کرام نے
...کی نقول کروا کر مختلف علاقوں میں بھیج دی تھیں۔ چودہ صدیاں گزر گئیں
...قرآن کریم میں زیر و زبر اور شوشہ و مد کا فرق بھی نہیں آیا۔ اسلام کے مخالف
...قرآن کریم کے محفوظ اور غیر محرّف ہونے کے معترف ہیں۔ قدیم و جدید قرآن
...ذرہ بھر فرق نہیں۔ اسی طرح کرۂ ارضی کے دور افتادہ کونوں تک قرآن
...کے جو نسخے پائے جاتے ہیں ان میں سر مو فرق نہیں آیا۔

سوال ۴۳ :۔ ذیل کے پانچ مشہور مذاہب کے پیش کردہ نظام ہائے حیات کا تقابل کیجئے؟

جواب :۔ بعض مذاہب سرے سے کوئی نظام حیات پیش ہی نہیں
...مثلاً بدھ مت اور عیسائیت میں نظامِ حیات کا کوئی تصور موجود نہیں

یہ دونوں مذہب ایک نظامِ اخلاق پیش کرتے ہیں اور بس۔ لہٰذا اس امر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی تعلیمات سے انسان کی زندگی میں وہ یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو کسی نظامِ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں مذاہب انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندومت اور یہودیت ضابطۂ اخلاق سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی کے بارے میں ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن ہندومت ذات پات کی تمیز اور بنی نوعِ انسان کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا کر دینے کی وجہ سے بھی ناقابلِ قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منوسمرتی میں بیان کردہ ہندومت کے قوانین خود ارضِ ہند میں بھی معمول بہا نہیں ہیں اور ان کی جگہ نئے قوانین بنائے اور چلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیت صرف بنی اسرائیل کی قوم تک محدود ہے اور اس لئے اسے ایک نسلی مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ یہودی نہ خود تبلیغ کرتے ہیں اور نہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کا مذہب اختیار کرے۔ ہندومت اور یہودیت دونوں کے قوانین بہت سخت ہیں اور ان میں کوئی لچک نہیں پائی جاتی۔ یہ دونوں مذہب کوئی ایسا جامع نظریۂ حیات پیش نہیں کرتے جو آئندہ ادوار میں انسانیت کی رہنمائی کر سکے۔ مزید برآں لچک نہ ہونے کی وجہ سے یہ زمانہ کے ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

علاوہ ازیں ان میں سے کوئی مذہب بھی کامل ہونے کا دعویدار نہیں۔ ہندو مت اور بدھ مت کے سلسلہ میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک یہودیت اور عیسائیت کا تعلق ہے ان کی کتبِ مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک آنے والے کی بشارت دی تھی جو دین کو مکمل کرے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا

"میں ان کے لیئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور
اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان
سے کہے گا۔" (استثناء: ۱۸-۱۹)
حضرت عیسیٰ نے فرمایا:۔
"لیکن وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا)
میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو
میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا: ۱۴-۲۶)
جملہ مذاہب کے برعکس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا ہے
ہر لحاظ سے کامل اور انسانیت کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ قرآن
کریم نے آپ کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا	اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پسند کیا۔

دین اسلام ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے
اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ اسلام میں اخلاق و عبادت نیز سیاسی و
معاشرتی اور تمدنی و اقتصادی مسائل و احکام کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ اسلام
کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ اس میں انسان کو اتنی آزادی دی گئی ہے کہ وہ
بے مہار ہو جائے اور نہ ہی اسے ہر طرح محدود و مقید کیا گیا ہے۔ قرآن کریم
کے ذریعہ زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں
کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے مطابق قوانین مدوّن کئے جا سکتے ہیں
دین اسلام میں ہر دور کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے
اس ضمن میں کوئی مذہب اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔

دورِ حاضر کی تحریکیں اور مذاہب

سوال ۴۲ :- جدید تہذیب کن عناصر سے مل کر بنی اور
کون سے اسباب تھے جنہوں نے ان عناصر کو جنم

جواب :- مغربی ممالک میں جو تہذیب آجکل تہذیب جدید کے
نام سے رائج ہے وہ وہاں شروع ہی سے موجود نہ تھی۔ موجودہ تہذیب کی
عمر صرف پانچسو سال ہے۔ اس سے پہلے زمانہ کو تاریک دور (DARK AGES)
کہتے ہیں۔ اس دور میں یورپ پر ظلمت و جہالت چھائی ہوئی تھی اور لوگ علوم
فنون کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس تاریک دور
میں علم و ہنر کی روشنی کیونکر آئی؟ یہ نئی روشنی جس کو تہذیب جدید کہتے ہیں
وہ کن عناصر کی پیداوار ہے، اور کن اسباب نے ان عناصر کو جنم دیا؟

تہذیب جدید کے عناصر

موجودہ مغربی تہذیب پانچ عناصر کی پیداوار ہے جو یہ ہیں

۱۔ فلسفۂ مادیت

۲۔ نظریۂ الحاد

۳۔ جمہور کی حاکمیت

۴۔ قوم پرستی کا جذبہ

۵۔ حیوانی ازدواج کا نظریہ

یہ پانچ عناصر ہیں جن پر جدید تہذیب کی پرشکوہ عمارت کھڑی ہے۔ ایک
یہی وہ روشنی کا مینار ہیں جن سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکلی ...

کر تہذیب جدید کے متوالوں کے قلب و دماغ کو متوذ کر رہی ہے۔

تہذیبی عناصر کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب نے تہذیب جدید کے مذکورہ صدر عناصر کو جنم دیا:۔

۱۔ یورپ کا نظامِ جاگیرداری :۔ ہر ملک چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں منقسم
تھا۔ جاگیردار اپنے علاقہ میں خود مختار سمجھا جاتا تھا۔ مزارعین کی حیثیت کسی طرح بھی
غلاموں سے بہتر نہ تھی۔ کاشت کار زمین چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا اور اسے
کاشت کاری پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ مزارعین ہر لحاظ سے جاگیردار کے محتاج ہوا
کرتے تھے۔ اس زمانہ میں کاشت کاری کے سوا اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔
صنعت و حرفت برائے نام تھی۔

۲۔ طبقاتی تقسیم :۔ معاشرہ دو طبقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔

(۱) امراء (۲) غرباء

طبقہ امراء میں جاگیردار اور مذہبی پیشوا شامل تھے۔ یہ لوگ حد درجہ عیاش تھے
شراب خوری اور حرامکاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ دوسرے طبقہ کے لوگ
بنیادی ضروریات کو بھی ترستے تھے۔ دونوں طبقات کی زندگی میں حد درجہ تفاوت
پایا جاتا تھا۔

۳۔ جنگ و جدل :۔ طبقہ امراء باہم نبرد آزما رہتا تھا چونکہ باتنخواہ فوج
کا رواج نہ تھا۔ اس لئے مزارعین فوجی سپاہیوں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔
کسان ایک تو ویسے تنگدست تھے۔ پھر آئے دن کی جنگوں نے انہیں اور
خستہ کر دیا تھا۔

۴۔ مذہب سے ناجائز فائدہ :۔ تمام مظالم کا جواز ثابت کرنے کیلئے
مذہب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا تبدیل شدہ مذہب ایک ایسا طلسم

تھا جس کو ہر بدنما چیز پر چڑھا کر اسے خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ مذہبی طبقہ
اسرار کا آلۂ کار تھا اور ان کے ہر فعل پر صاد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

۵۔ مسلمانوں کی نقالی :۔ تاریکی کے اس دور میں مسلمانوں نے یورپ کے
کچھ حصہ کو فتح کر لیا اور کچھ حصہ سے تجارتی مراسم قائم کر لئے۔ مسلمان علوم و
فنون کے شیدائی اور صنعت و حرفت میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔
ان کی دیکھا دیکھی یورپ میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا۔ عیسائیوں نے مسلم علماء
اور قدیم یونانی فلاسفہ کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ تقریباً ایک ہزار سال کے
بعد یورپ میں علمی بیداری پیدا ہوئی۔ تاریخ کی اصطلاح میں اس تجدید کو
نشاۃِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس مطالعہ کی بنا پر یورپ میں روشن خیالی کے
آثار پیدا ہوئے۔

۶۔ علمی تحریک کی مخالفت :۔ یورپ کے مذہبی رہنما اس علمی تحریک سے
گھبرا اٹھے اور اس میں حصہ لینے والوں پر کفر کا فتویٰ لگا کر ان کو سخت ترین
سزائیں دینے لگے۔ کہا گیا ہے کہ تین لاکھ آدمیوں کو اس جرم میں سخت
سزائیں دی گئیں۔ بتیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ طبیعیات کے مشہور
عالم برونو کو صرف اس جرم میں نذرِ آتش کر دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض کے
علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ مشہور سائنسدان
گیلیلیو کو اس بنا پر قید کر دیا گیا کہ وہ زمین کے علاوہ زمین کے سورج کے
گرد گھومنے کا قائل تھا۔

۷۔ چرچ سے نفرت :۔ کلیسا (چرچ) کے ان لرزہ خیز مظالم کے خلاف
عوام میں نفرت و حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ غرض متدین لوگوں کو چھوڑ کر
کلیسا سے نفرت کرنے لگے۔ عداوت کے اس جوش میں انہوں نے نہ صرف

غلط مذہب اور غلط قسم کے مذہبی پیشواؤں بلکہ سرے سے مذہب ہی کو مٹا دینا چاہا جو جنگ پہلے عیاش قسم کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔ اب عیسائی مذہب کے خلاف اور پھر ہر مذہب کے خلاف لڑی جانے لگی۔ ان لوگوں میں اس قدر صبر و تحمل نہ تھا کہ صحیح و غلط مذہب کے مابین فرق کرتے اس لئے وہ غصہ میں آکر ہدایت خداوندی ہی کے باغی ہو گئے۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدی میں الحاد کا آغاز ہوا۔

۸۔ تاجروں اور جاگیرداروں کے مناقشات:۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے معاشرہ میں صنعت کاروں اور تاجروں کا طبقہ ابھرا۔ اس طبقہ نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ جلد از جلد جاگیرداری کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جاگیرداروں کے پنجہ سے رہائی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ بادشاہ پہلے ہی جاگیرداروں کے خلاف تھا۔ تاجر طبقہ نے چاہا کہ جاگیرداری سسٹم کو ختم کرنے اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ تاجروں نے بادشاہ کے ساتھ مل کر جاگیرداروں کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اس طرح قومی ریاست کی بنیاد پڑی۔

۹۔ پوپ کی مخالفت:۔ کلیسا کی بدنظمی اور پوپ کی بدعملی نے یورپ بھر میں افراتفری پیدا کر دی۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو مذہب کو اس بدعملی کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود مذہب ہی سے متنفر ہو گئے تھے۔ دوسرے لوگ مذہب کے مخالف تو نہ تھے البتہ وہ یورپ کے لئے ایک پوپ کے وجود کو بدعملی کا باعث قرار دیتے تھے۔ انہوں نے پاپائے رُوم کی برتری کا انکار کر کے قومی چرچ کی کلی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ تاریخ میں اس کو "اصلاح مذہب" کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک

کے ذمہ دار دو بڑے لیڈر تھے۔ میکاولی منکرین مذہب کا قائد تھا اور کوتھر مذہبی طبقہ کی سیادت سنبھالے ہوئے تھا۔

۱۰۔ نظریۂ قومیت :۔ قومی ریاستوں کے قیام سے صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا اور صنعتی پیداوار کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش میں کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں مسابقت کے جذبہ کا ابھرنا ایک فطری امر تھا چنانچہ اس مسابقت نے عداوت کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آڑے وقت میں جس نظریہ نے لوگوں میں لڑنے مرنے کی روح پیدا کر دی وہ قومیت کا نظریہ تھا۔ مغربی لوگ اس تازہ محسوس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے لگے۔ ہر ہر فرد میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کو زندگی کے تمام گوشوں سے خارج کر دیا گیا۔ فلسفہ، اخلاق، معیشت، معاشرت اور سیاست سب مذہب سے بے نیاز ہو گئے۔ ہر نادیدہ چیز سے انکار کو روشن خیالی کی دلیل سمجھا جانے لگا۔ اخلاق کا معیار ذاتی نفع کو قرار دیا گیا۔ قانون سازی میں الہامی و اخلاقی پابندیوں کو نادانی پر محمول کیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ زندگی کے تمام گوشوں سے مذہب کو دیس نکالا دے کر مکمل طور پر اسے مادی بنا دیا گیا۔ یہ اسباب و وجوہ ہیں جو تہذیب جدید کے عناصر کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

سوال ۴۵ :۔ تہذیب جدید کے عناصر ترکیبی کا مختصر تعارف کروائیے ؟

جواب :۔ جدید تہذیب نے پانچ عناصر سے ترکیب پائی ہے۔

ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

۱۔ فلسفۂ مادیت :۔

اس فلسفہ کا انحصار دو باتوں پر تھا

۱۔ زندگی کا مادی تصوّر

اس تصور کا حاصل یہ ہے کہ یہ کائنات مادہ ہی کا کرشمہ سازی ہے یادہ کے سوا دنیا میں کوئی چیز حقیقی نہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا شعور اور ارادہ بھی ایک مادی چیز ہے۔ اس کائنات کو سمجھنے کے لئے مادی قوانین کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

۲۔ مادیت کا اخلاقی نظریہ

اس نظریہ کے مطابق انسان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ جسمانی لذت کا حصول ہے۔ اس کے سوا دنیا کی ہر چیز بے کار اور غیر ضروری ہے۔ انسان کی جدوجہد کا حاصل صرف لذت و نفع اندوزی ہے۔ مادی طرز فکر اہل یورپ پر چھایا ہوا ہے۔

ایک مغربی مفکر لکھتا ہے

" یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی محنت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ہو، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے اور اس کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، آرام و راحت سے بھرپور اور عام خیال کے مطابق فطرت سے آزاد بنا سکے "

۲۔ لادینیت :۔

لادینیت فلسفۂ مادیت کو تسلیم کرنے اور عملاً اس کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر اس کائنات میں ہر طرف مادہ ہی مادہ کی عملداری ہے تو اس کے لئے نہ کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے اور نہ قائم رکھنے والے کی۔ خالق نہ ہونے کی صورت میں جزا و سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سے یورپ میں مادی نظریۂ حیات کا غلبہ ہوا ہے، بہت کم لوگ خدا کے قائل رہے ہیں۔ یورپ کے اکثر لوگ آج کل مذہب سے بے نیاز ہیں لادینی افکار کے غلبہ کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۳۔ حاکمیتِ جمہور:۔

فلسفۂ مادیت کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی حاکمیت کے برعکس انسان کو حاکم قرار دیا گیا۔ جب انسان کو کسی نے پیدا نہیں کیا تو کسی کو آقائی کا منصب آخر کیوں سونپا جائے؟ لہٰذا یہ نظریہ ایجاد ہوا کہ انسان آپ اپنا مالک ہے۔ وہ جو قانون چاہے بنائے اور جس اصول کو چاہے توڑے۔ اب یہ سوال اٹھا کہ انسان باہم مختلف الرائے ہوتے ہیں۔ آخر کس کی بات مانی جائے اور اقتدار کا منصب کس کو تفویض ہو؟۔ اس سوال کے جواب میں ایک فرضی چیز تلاش کی گئی جس کو مشہور مفکر روسو "رائے عامہ" کا نام دیتا ہے۔ بایں طور حاکمیتِ انسان کے تصور نے حاکمیتِ جمہور کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام اپنے جذبات و احساسات میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔ حلال و حرام کا فیصلہ ان کی رائے پر منحصر ہے۔ مذہب و اخلاق کا فیصلہ اگر لوگوں کی رائے کے خلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔ کسی حکومت کی اصل طاقت وہاں کے عوام ہیں۔

اس فلسفہ نے حاکم و محکوم کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا اور حاکم و محکوم کا فرق و امتیاز مٹ گیا۔

بظاہر یہ نظریہ بڑا پرکشش ہے کہ عوام کو جاگیرداروں کے مظالم سے رہائی نصیب ہو اور وہ اپنی بہتری کے لئے کام کر سکیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کے باوصف انسانیت کے مصائب میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کا نظریہ ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انتخاب اور استصواب کے پس پردہ جس رائے پر عمل کیا جاتا ہے وہ یا تو کسی ڈکٹیٹر کی ہوتی ہے یا چند اصحاب اقتدار کی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو مظالم قدیم سلاطین ڈھایا کرتے تھے دنیا کا ہوشیار طبقہ حاکمیت جمہور کے نام پر انہی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بے شک عوام کو دوسروں کے مظالم سے نجات ملنی چاہیئے لیکن ان کی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ وہ ایسے اصول و احکام کو اپنائیں جن میں کسی کی خود غرضی یا کج روی کو دخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جمہور صرف اسلامی اصولوں کی پیروی ہی سے یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ جذبۂ قوم پرستی :۔

جب مادی فلسفہ نے یورپ میں مذہب کی دھجیاں اڑا دیں اور اہل یورپ کو متحد کرنے والی کوئی چیز باقی نہ رہی تو اس کی جگہ قوم پرستی کے جذبہ نے لے لی۔ اس جذبہ نے سیاسی تقسیم کے باوجود یورپ کی شیرازہ بندی کر دی۔ اس نظریہ کے تحت قوم کو وہی حیثیت دی گئی جو مذہب میں شارع کو حاصل ہے۔ قوم معصوم ہے اور اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد پر قوم کی اطاعت فرض عین ہے اور اس سے انحراف کفر ہے۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تمام اقوام نے اپنے چھوٹے چھوٹے دائرے بنا لئے۔ انہوں نے ہر

اس چیز کو کفر خیال کیا جو ان کی خاکِ وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ یہ قومی تعصب اس حد تک بڑھا کہ قوموں نے دوسری اقوام کی اعلیٰ اقدار کو ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ جرمنی کا ایک پروفیسر لکھتا ہے۔

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں۔ انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیئے"

نظریۂ قومیت کا نتیجہ ہولناک جنگوں کی صورت میں رونما ہوا۔ دنیا کی وہ عظیم ترین جنگیں جنہوں نے کائنات کے ہر گوشہ کو انسانی خون سے لالہ زار بنا دیا اسی نظریہ کی پیداوار تھیں۔

۵۔ حیوانی ازدواج کا نظریہ :-

جب یورپ میں مذہب و اخلاق کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ شرم و حیا اور عفت و عصمت کے پاکیزہ جذبات سے محروم ہو گیا۔ ہر طرف جنسی بے راہروی اور صنفی انارکی کے مظاہر نظر آنے لگے۔ آزادانہ میل جول، بے روک ٹوک شہوت رانی اور ہر قیمت پر شہوت رانی زندگی کا مقصد قرار پائی۔ عورتوں کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک کیا جانے لگا۔ نکاح کو ایک غیر ضروری بندھن قرار دیا گیا۔ عورت کو معاشرتی پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ کلب گھر، ناچ گھر اور شراب خانے عورت کی زینت سے مزین ہونے لگے۔ اس فلسفہ کا اثر یہ ہوا کہ نکاح کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس کے بعد نکاح سے عام بیزاری کا رجحان پرورش پانے لگا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوند خاک ہو گئی۔ حیوانی ازدواج کے نظریہ سے دو بڑے نتیجے نکلے۔

ا۔ اس فلسفہ کا پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ معاشرتی زندگی کی جڑیں ہل گئیں۔ حسب و نسب کو بیکار چیز سمجھا جانے لگا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف

سے غفلت برتی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ معاشرے کی بربادی اور خاندانی نظام کی تباہی کی صورت میں نکلا۔

۲۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ جنسی بے راہروی کے مظاہر ہر جگہ نظر آنے لگے اس فلسفہ نے لوگوں کو یہ سبق دیا کہ آزاد محبت تقاضائے فطرت ہے۔ نکاح کی پابندی غیر فطری اور غیر ضروری ہے۔ اس کے نتیجہ میں یورپ کا ہر ہوٹل ہر پارک، ہر محلہ بداخلاقی کا مرکز بن گیا۔ روس بھی اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ روسی رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا کہ کوئی چیز ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ جنسی تعلقات میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس میں ہر طرف جنسی انارکی کے مظاہر نظر آنے لگے۔

انہی حالات کے پیش نظر علم طبیعیات کی مشہور ماہر مسز ہڈسن شا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ عمارت کب پیوند خاک ہو جائے۔ ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کی بقا کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے۔"

معاشرتی ارتقاء کا تصور اور اس کے نتائج

سوال ۴۶ :۔ معاشرتی ارتقاء کے نظریہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے مشہور مفکرین کے افکار و نظریات قلمبند کیجئے۔

جواب :۔ جدید تہذیب کے عناصر نے نیک خیالات اور پاکیزہ جذبات کو جس طرح نابود کیا تھا معاشرتی ارتقاء کے تصور نے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ معاشرتی ارتقاء کے تصور نے مادہ پرستی کے پیٹ سے جنم لیا۔ نفع اندوزی کے جذبہ نے اسے پروان چڑھایا اور سائنسی ترقی نے اسے قبول عام بخشا۔ جونہی اس نظریہ نے ترقی پائی عدل و انصاف کی جگہ جور و استبداد نے لے لی۔ شرافت رخصت ہو گئی اور اس کی جگہ شیطنت کا عمل دخل نظر آنے لگا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس دور میں ہر قسم کے فتنہ و فساد اور سفاکی کو اخلاق عالیہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یوں تو یہ نظریہ بہت سے اصحاب فکر کے دماغ کی اختراع ہے مگر ہیگل، مارکس اور ڈارون کی خدمات خاص طور پر قابل تحسین ہیں۔ ذیل میں ہم ان مفکرین کے افکار کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

ہیگل :۔

ہیگل کے نزدیک پوری انسانی تاریخ "فلسفۂ اضداد" پر مبنی ہے۔ تاریخ انسانی کا ہر دور ایک وحدت ہے۔ اس وحدت کے اجزاء باہم مربوط ہیں۔ تاریخ انسانی کا یہ قافلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پھر کچھ مخالف افکار و نظریات

پہلے نظریات میں سے پیدا ہوتے ہیں اور دونوں قسم کے نظریات میں شدید جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ جنگ ایک خاص مدت تک جاری رہتی ہے پھر ان میں صلح ہو جاتی ہے۔ دونوں عناصر میں سے غیر مفید اجزا چھانٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور صالح اجزاء باقی رہتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے صالح اجزا مل کر ایک وحدت کو جنم دیتے ہیں۔ یہ وحدت ایک نئے نظام فکر و عمل کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور پھر وہی پہلا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نظریات کا یہ تصادم ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور جاری رہے گا۔ افکار و نظریات کا یہ تصادم عملاً اقوام کے ٹکراؤ کی صورت میں ہوتا ہے۔

ہیگل کی رائے میں ہر قوم ایک خاص تہذیب اور ایک خاص فکر کی حامل ہوتی ہے۔ لہٰذا افکار کا تصادم در اصل اقوام کا تصادم ہے۔ اسی لئے انسانی ترقی کے لئے اقوام کا برسر پیکار رہنا ہیگل کے نزدیک ضروری ہے۔

کارل مارکس

کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو بنیادی حیثیت سے تسلیم کر لیا مگر اس میں بعض تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اس نے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو انسانی ترقی کی بنیاد قرار دیا۔ مارکس اگرچہ ہیگل کے جدلی فلسفہ کو درست تسلیم کرتا ہے مگر اس کی رائے میں فیصلہ کن قوت افکار نہیں بلکہ مادی ماحول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشی اسباب ہی کسی قوم کی ذہنی زندگی کو بناتے ہیں۔ اس کے نزدیک انسانی ترقی کی صورت یہ ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس سے زندگی کی ساری قدریں بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام معرض وجود میں آتا ہے۔ اب ہیگل کے فلسفہ کے مطابق جدید و قدیم نظام کے مابین جنگ بپا ہوتی ہے۔ غیر صالح اجزا نابود

ہو جاتے ہیں اور صالح اجزا باقی رہتے ہیں۔ صالح اجزاء کی ترکیب سے ایک نیا نظام وجود پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مارکس کی رائے میں اجزائے تمدن اور اخلاقی قدروں کا تصادم اقوام میں نہیں بلکہ معاشرہ کے طبقات میں ہوتا ہے۔ اس طبقاتی جنگ کو بپا کرنے والی چیز معاشی اسباب ہیں۔ مارکس کے نزدیک اصل وحدت قوم نہیں بلکہ سوسائٹی کے طبقات ہیں۔ ہیگل جس طرح انسانی ارتقاء کے لئے اقوام کی جنگ کو ضروری قرار دیتا ہے اسی طرح مارکس کے نزدیک طبقاتی کشمکش ارتقاء کے لوازم میں سے ہے۔

ڈارون

ڈارون نے معاشرتی ارتقاء کے نظریہ پر زبردست اثر ڈالا۔ ڈارون کے نظریہ کی بنیاد تنازع للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) پر ہے۔ ڈارون کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہر جاندار میں پھلنے پھولنے بڑھنے اور شکل وصورت کو تبدیل کرنے کا ایک فطری میلان پایا جاتا ہے لیکن یہ خواہش کمزور تر حیوانات کی موت اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ڈارون کے خیال میں یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جس میں موت و حیات کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور ہر طاقتور کمزور کو ختم کر دینے کا آرزومند ہے جو جاندار اس میں زیادہ طاقتور ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ دراصل زندہ رہنا صرف طاقتور کا حق ہے اور کمزور کو نعمتِ حیات سے بہرہ ور ہونے کا کوئی حق نہیں۔

کمزور کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں لہٰذا اسے چاہیے کہ کائنات کو اپنے ناتوان وجود سے جلد از جلد پاک کر دے۔ دنیا میں اسی طرح ارتقاء

کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ خود انسان بھی بڑی دشوار گزار منزلوں سے گذر کر انسانیت کے مقام تک پہنچا ہے۔ زندگی کی اس تجربہ گاہ میں سے جو کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے وہ صالح ہے اور اسے زندہ رہنے اور ترقی پذیر ہونے کا حق حاصل ہے۔

سوال ۴۷:۔ معاشرتی ارتقاء کے بنیادی اصول اور نتائج بیان کیجئے؟

جواب:۔ معاشرتی ارتقاء کے ہر سہ مفکرین یعنی ہیگل کارل مارکس اور ڈارون کے افکار کو جمع کرنے سے بحیثیت مجموعی جو نتیجہ سامنے آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی ارتقاء کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

بنیادی اصول:۔

۱۔ انسانی ارتقاء کا راز صرف اقوام و افکار کی باہمی آویزش و کشمکش میں مضمر ہے۔

۲۔ دنیا میں صرف طاقتور کو جینے کا حق حاصل ہے۔ ناتوان کو جلد از جلد اس صفحہ ہستی سے نابود ہو جانا چاہیئے۔

۳۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد کامیابی ہے خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔ اس طرز فکر پر جامع تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے۔ برملا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس فلسفہ نے اشرف المخلوقات انسان کو خونخوار درندہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ جنت ارضی جس میں انسانی زندگی کے راحت و آرام کے جملہ لوازمات موجود ہیں۔ انسان کے لئے جہنم بن گئی۔ اس فلسفہ نے انسانیت کو بحیثیت مجموعی جو کچھ دیا اس کا مختصر بیان حسب ذیل ہے۔

معاشرتی ارتقاء کے نتائج :-

۱۔ اس فلسفہ نے انسانیت کو پہلا تاثر یہ دیا کہ مادی ترقی ہی انسانی زندگی کی معراج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کے مختلف گروہ اور طبقات مادی اسباب کی فراہمی میں دیوانہ وار لگ گئے۔ فرد اور قوم پہ مادی ترقی کا بھوت سوار ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو صفحۂ ارضی سے مٹ جاتے قوموں کی اس مسابقت نے کمینہ عادات مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، خیانت کاری اور نمود و نمائش کا تحفہ بخشا اور مذہب و اخلاق، شرافت اور شرم و حیا کا سب سرمایہ چھین لیا۔

اس طرز فکر نے انسان کے مستقبل کو تاریک کر دیا۔ اس نے انسان کو کائنات کی حدود و قیود سے آشنا کیا مگر اس کی زنجیروں سے رہائی حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ہوتا چلا جا رہا ہے۔

۳۔ چونکہ اس فلسفہ کے نزدیک ارتقائے انسانی کا راز کشمکش اور آویزش ہی میں مضمر ہے اس لئے اس نظریہ نے انسان میں حسد و بغض کے جذبات پیدا کر دیئے۔ یہ فلسفہ انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ اگر ترقی کرنا چاہتے ہو تو اپنا سب کچھ جدال و تنازع کی نذر کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے موجودہ انسان کو بے رحم اور سنگدل بنا دیا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے اگر کوئی شخص کسی پر مظالم توڑتا ہے تو وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں جینے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ مظلوم کا حق ہے کہ وہ دوسروں کے مظالم برداشت کرتا اور لوگوں کے پاؤں تلے پامال ہوتا رہے۔ انسان لڑنے جھگڑنے کا عادی پہلے بھی تھا مگر اسے قبیح تصور کرتا

تھا۔ اس فلسفہ نے ثابت کر دیا کہ اس میں قباحت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ علیح لیگی ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے۔

"انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ آج کوئی ظالم کے ظلم کو مٹانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ درندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔"

۴۔ اس فلسفہ کی بدولت انسانی ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ ہر فعل جو مادی اعتبار سے کامیاب ہو انسانی ترقی کا ضامن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان قوت و شوکت کا پرستار بن گیا۔ اس نے اپنی ذہانت کو ایسے کاموں کی تلاش کے لئے وقف کر دیا جن سے اس کی قوت میں اضافہ ہو۔ اسی نقطۂ نظر نے جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ سامراج کو جنم دیا۔

۵۔ اس طرزِ فکر نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا۔ اس فلسفہ نے انسان کو سکھایا کہ اس کا اصلی نصب العین قوت و اقتدار کا حصول ہے۔ یہ مقصد اگر مذہب و اخلاق سے نکلتا ہو تو ان سے کام لینے میں ہرج نہیں اور اگر مذہب و اخلاق کو ترک کر دینے سے کامیابی حاصل ہو تو انہیں ترک کر دینا چاہیئے۔ اسی نظریہ کی بدولت پچھلی چار صدیوں میں میکاولی کے خیالات کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ گوبلز نے کہا تھا۔

"ہماری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تحریک مذہب کی پیش کردہ اخلاقی قیود سے آزاد ہے۔"

یہ ہیں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات دنیا کی ہر مادی تحریک ہمیشہ انہی نتائج کی حامل ہوا کرتی ہے خواہ یورپ کی

لادینی جمہوریت ہو یا چین و روس کی اشتمالیت یا ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت
یہ سب تحریکیں خالص مادی ہیں۔ ان کی بنیادی روح ایک ہی ہے اس لئے
ان میں کامل یگانگت پائی جاتی ہے۔

اشتمالیت

سوال ۵۳ :- اشتمالیت (کمیونزم) کیا چیز ہے اور زندگی کے بنیادی مسائل کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟

جواب :- سرمایہ دارانہ جمہوریت کی وجہ سے معاشرہ جن خرابیوں میں مبتلا ہو گیا تھا اشتمالیت ان کو دور کرنے کے لئے عالم وجود میں آئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں فلسفۂ مادیت کی پیداوار اور بڑی حد تک باہم مماثل ہیں۔ ان دونوں کی ماں مادیت ہے اور دونوں نے مادی فلسفہ کی گود میں پرورش پائی ہے۔ معاشرتی مسائل ہوں یا اخلاقی اقدار اجتماع ہو یا قانون و سیاست اور علم و فلسفہ سب کی بنیادی قدریں دونوں میں یکساں ہیں۔ اشتمالیت مادی فلسفہ کی انتہائی موثر و منظم صورت کا نام ہے اس نے مختلف شعبہ ہائے حیات کو مادیت کے سانچہ میں ڈھال کر باہم مشابہ و مماثل بنا دیا ہے۔ اشتمالیت صرف مفلس لوگوں کے پیٹ ہی کا مسئلہ حل نہیں کرتی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مستقل نظامِ فکر ہے جو فلسفہ، اخلاق، تہذیب تمدن اور مابعد الطبیعاتی افکار کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان پورے اشتمالی فلسفہ پر ایمان لائے بغیر صرف اس کے پیش کردہ معاشی نظام کو اختیار کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ جاہل ہے یا منافق۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ اشتمالی نظامِ فکر کی کچھ باتیں مان لیں اور باقی باتوں کو نظر انداز کر دیں اشتمالی فلسفہ کی کڑیاں باہم اس قدر مربوط ہیں کہ انکو ایک دوسرے سے مربوط کرنا محال ہے

اشتمالی فلسفہ حیات :-

زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً یہ کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں کیا ہے اس کی زندگی کا نصب العین کیا ہے۔ ان مسائل کے بارے میں اشتمالیت کا زاویہ نگاہ سراسر مادی ہے۔ اس کائنات پر جو کچھ ہے وہ مادی قوانین کا پابند ہے۔ اس فلسفہ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ خدا کا تصور نہ صرف خلاف عقل و فطرت بلکہ انسانیت کے لئے مہلک ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق جب انسان کائنات کے اسباب و آثار سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ مجبور ہو کر ایک بالاتر ہستی کے تصور میں پناہ لیتا ہے۔ جیسے انسان مادی قوانین کی گتھیوں کو سلجھائے گا تو اس کے دل سے خدا کا تصور خود بخود اٹھ جائے گا۔ بنا بریں خدا کا تصور مادی قوانین سے جہالت کی پیداوار ہے۔ جوں جوں سائنس کے ذریعہ کائنات کے خفیہ راز منظرِ عام پر آتے جائیں گے، انسان بے خدا ہوتا چلا جائے گا۔

جو فلسفہ انسان کو بے خدا بنا دے وہ اس کے ذہن میں اس تصور کو بھی پختہ کر دے گا کہ انسان ایک عارضی اور اتفاقی چیز ہے جسے فطری قوتوں نے جنم دیا اور جو ان کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کی حقیقت مادہ سے زیادہ کچھ نہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مادی دنیا میں قوت و شوکت ہی کو سب سے اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر آخرت کا تصور خود بخود مہمل نظر آنے لگتا ہے۔ مادی طرزِ فکر کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان غیر ذمہ دار اور خود غرض ہو جاتا ہے۔

معاشرتی زندگی میں مسابقت اور دوسروں سے آگے نکل جانے کا جذبہ اسی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ اس تگ و دو سے معاشرہ کا سکون و اطمینان غارت ہو جاتا اور شر و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

تاریخ کی مادی تعبیر

سوال ۴۹ :۔ مارکسی فلسفہ میں تاریخ کی مادی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ اس نظریہ پر تنقید کیجئے۔

جواب :۔ تاریخ کی مادی تعبیر مارکسی فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ معاشی نظام ہی کسی عہد کی معاشرتی زندگی کی اصل و اساس ہے۔ نہ صرف مذہب، تہذیب، فلسفہ حیات اور فنونِ لطیفہ ہی اس کے تابع ہیں بلکہ تمام انسانی جذبات و احساسات پر اسی کی حکمرانی ہے۔ انسان کے سب تجربات و مشاہدات معاشی نظام کے زیرِ اثر ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ کے مسئلہ کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مسائل ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انسان کا اصل مسئلہ صرف روٹی کا مسئلہ ہے اور اسی کے توسط سے زندگی کی تمام قدریں جنم لیتی ہیں۔

جوں جوں علوم و فنون بڑھتے جاتے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ ضرورتیں معاشی انقلاب بپا کرتی ہیں اور اسی انقلاب کے گرد ساری کائنات کا نظام گردش کرتا ہے۔ جس نسبت سے ذرائع پیداوار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، زندگی کے تمام شعبے اسی رنگ میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ جدید ایجادات کا سلسلہ چونکہ ختم ہونے میں نہیں آتا اس لئے ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اسے ہم "تاریخی انقلاب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی تغیر پذیری کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کو کسی منزل پر سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ زندگی کا قافلہ

جب ایک منزل پر آکر رُکتا ہے تو آگے بڑھنے کا شوق اسے پھر بے چین کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کی بدولت اخلاق اقدار کا ایک نہایت نیا تصور سامنے آتا ہے اس نظریہ کے پیشِ نظر دنیا کی کوئی صداقت دائمی نہیں۔ ہر دور کی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی قدریں پہلے دور کی قدروں کو بے وقعت بنا دیتی ہیں۔ اس لئے نیکی بدی، خیر و شر یا حق و باطل کوئی چیز نہیں۔ ایسی کوئی صداقت نہیں جو ہر زمانے کے لئے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے ہر دور کے اپنے مسائل اور خاص عقائد و اعمال ہوتے ہیں۔ ایک چیز ایک دور میں حق اور دوسرے میں باطل ہو سکتی ہے۔ ایک عمل ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے اور دوسرے ماحول میں اسے بدی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی مسئلہ صرف پیٹ کا ہے۔ اس کے علاوہ تمام انسانی رجحانات و میلانات اور احوال و واقعات اسی کے تابع ہیں۔

تاریخ کی مادی تعبیر پر تنقید:-

۱۔ مارکس کے اس نظریہ کی زد سب سے پہلے اس کے اپنے فلسفہ پر پڑتی ہے۔ اگر کسی زمانہ کے تصورات و نظریات اس کے مخصوص معاشی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس کے بعد بیکار ہو جاتے ہیں تو اس کے اپنے افکار و نظریات کو بھی انیسویں صدی کے مخصوص معاشی نظام نے جنم دیا ہوگا اور جب وہ گزر گیا اور فکر و نظر کے دھارے بدل گئے تو اس کا فلسفہ فرسودہ و بوسیدہ ہو کر قابل عمل نہ رہا۔ نیز اس سے کمیونزم کا بھی فرسودہ اور بیکار ہونا لازم آتا ہے۔

۲۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشی نظام انسانی زندگی میں بڑی اہمیت

دکھتا ہے۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ تہذیب و تمدن کے سب لوازمات معاشی نظام ہی کے رہینِ منت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی تعمیر میں جس طرح معاشی نظام اہم پارٹ ادا کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے تقاضے بھی اس سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ جینے کے لئے انسان کو خوراک کی ضرورت ہے۔ گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے لباس درکار ہے اور سر چھپانے کے لئے مکان کی ضرورت ہے مگر یہ ضروریات اور ان کی فراہمی کی تدابیر اس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کی تخلیق نہیں کرتیں۔ ایک مصوّر تصویر بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصوّر کے رنگ ہی اس کے آرٹ کے اصل خالق ہیں۔

۳۔ مارکس کے فلسفہ سے لازم آتا ہے کہ جو معاشرے ایک ہی قسم کا معاشی نظام رکھتے ہوں ان کا تمدن اور مذہب و اخلاق بھی یکساں ہوں حالانکہ عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ مارکس کی تاریخی تقسیم کے پیشِ نظر رومی تمدن اور آغازِ اسلام کا تمدن معاشی اعتبار سے یکساں تھا۔ دونوں میں غلامی کا رواج تھا۔ معاشی طور طریقوں میں بھی چنداں فرق نہ تھا۔ مارکسی فلسفہ کے مطابق چاہیئے تھا کہ ان کے مذہب و اخلاق میں کامل یگانگت ہوتی مگر تاریخ کی شہادت اس کے برعکس ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں کے تصوّرات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ رومی تمدن میں غلاموں کو حیوانی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے غلام کو حیوانات کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔

۴۔ بہت سی قومیں ایسی گزری ہیں جن کا معاشی نظام بالکل یکساں

تھا مگر ان کا تمدن اور ان کی اخلاقی اقدار میں نمایاں فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقوام کی زندگی میں معاش ہی اصل قوت نہیں بلکہ زندگی کا اصل مقصود وہ بلند و بالا مقاصد ہیں جن کے لئے انسان زندہ ہے اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے معاش کا محتاج ہے۔ مارکس کے فلسفہ میں خامی یہ ہے کہ وہ انسانی ارادے و شعور کو معاشی ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ بے شک انسانی ارادہ معاشی عوامل سے متاثر تو ہو سکتا ہے مگر وہ ان کی پیداوار نہیں دراصل انسانی ارادہ ہر عمل کا محرک خود انسان ہے نہ کہ معاشی عوامل۔
۵۔ مارکس نے "قوت تاریخ" کو ذرائع پیداوار کی تبدیلی کا باعث قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ مارکس اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اگر قانون و اخلاق کی تبدیلی سیاسی نظام کی تبدیلی کا نتیجہ ہے اور سیاسی تبدیلی کا باعث معاشی ذرائع پیداوار کا تغیر و تبدل ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع پیداوار میں کمی بیشی کیونکر پیدا ہوتی مارکس نے تاریخی قوت کو اس کا سبب قرار دیا ہے مگر وہ یہ نہیں بتاتا کہ تاریخی قوت کیا چیز ہے۔ مارکس کے مادی فلسفہ کے یہاں اس کا کوئی جواب نہیں۔
۶۔ مارکسی فلسفہ کی رو سے مذہبی و اخلاقی تبدیلی چونکہ معاشی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے لہذا مذہبی انقلاب بپا ہونے سے قبل معاشی نظام کا بدلنا ضروری ہے لیکن تاریخ میں کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مذہبی انقلاب پہلے آیا اور معاشی تبدیلی بعد میں ہوئی۔ جب سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عرب میں ایک عظیم مذہبی انقلاب آیا اس سے پہلے معاشی نظام میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ معاشی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی، جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور مسلمانوں میں فارغ البالی و خوشحالی کا دور

دَورہ ہوا۔ اس سے مکمل طور پر نکھر کر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ذہنی انقلاب کسی معاشی انقلاب کے تابع نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق کی تبدیلی انسانی شعور و ارادہ کے زیر اثر وقوع میں آتی ہے۔

طبقاتی کشمکش

سوال نمبر ۵۰:۔ طبقاتی تنازع سے کیا مراد ہے؟ اس نظریہ پر ناقدانہ تبصرہ کیجئے۔

جواب:۔ مارکسی فلسفہ میں طبقاتی کشمکش تاریخ کی مادی تعبیر کا لازمی نتیجہ ہے۔ مارکس کی رائے میں معاشی نظام جب ترقی کر کے ایک خاص مقام پر پہنچتا ہے تو ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے طبقاتی کشمکش رونما ہوتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب ذرائع پیداوار میں تغیر واقع ہوتا ہے تو انسانیت کے جو طبقے پہلے پامال ہوتے ہیں وہ اس تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر افراد معاشرہ کو از سر نو طبقات میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پسماندہ طبقہ کی یہ بیداری ان لوگوں پر بہت گراں گذرتی ہے جو پر فریب طریقوں سے معاشی نظام پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسری جانب مظلوم طبقہ بڑی گرمجوشی سے معاشی نظام کی تبدیلی کا استقبال کرتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں شاید آنے والے معاشی نظام میں ان کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھے۔ اس طرح غالب و مغلوب دونوں طبقوں میں ایک نزاع و جدال بپا ہو جاتا ہے جسے "طبقاتی نزاع" کہتے ہیں۔ یہی کشمکش تاریخ کے ہر انقلاب اور جنگ کا سبب بنتی ہے۔

طبقاتی نزاع کے نظریہ پر ایک نظر:۔

ہمارے خیال میں مارکس کا یہ خیال درست ہے کہ مظلوم طبقہ بعض اوقات ظالم کے معاشی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کے خلاف نبرد آزما ہو گیا۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ انسانی معاشرے کے تمام

انقلابات اور تمام جنگیں محض "معاشی طبقاتی تقسیم" کی وجہ سے لڑی گئیں۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قومی لڑائیاں طبقاتی تنازعات کی نسبت زیادہ تند و تیز زیادہ خون ریز اور انسانی مستقبل کے لئے زیادہ ضرر رساں تھیں۔ دور حاضر میں جبکہ مارکسی فلسفہ کے مطابق دنیا کے تمام انسان دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر ثابت ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا مزدور طبقہ روس کے مزدور بھائیوں کے خلاف جنگ آزما ہو گیا۔ انگلستان کے سرمایہ دار طبقہ نے جرمنی کے سرمایہ داروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جب اسلام کا انقلاب آیا تو اس وقت عرب میں کوئی طبقاتی نزاع موجود نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ انتہائی تونگر ہونے کے باوجود حضرت بلالؓ جیسے تہی دست کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اپنے بھائی بندوں سے لڑے۔

انقلاب فرانس میں معاشی اسباب کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے۔ اگر انقلاب فرانس کا واحد سبب طبقاتی تقسیم ہوتی تو فرانس سے زیادہ شدید انقلاب اس سے پہلے انگلستان میں آنا چاہیئے تھا اس لئے کہ وہاں صنعتی ترقی کی بنا پر طبقات کی جدید تقسیم نمایاں تر تھی مگر انگلستان کے انقلاب کو پُر امن ہونے کی بنا پر "شاندار انقلاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں کمیونسٹوں کے متفقہ فیصلے کے باوجود روس کے سوا کسی ملک کے اشتراکی لیڈروں نے اپنی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کیا جس سے "عظیم لینن" اور اس کے رفقاء سخت مایوس ہوئے۔ اس سے واضح ہوا کہ تاریخی جنگوں میں طبقاتی کشمکش سے زیادہ قومی تعصب یا دیگر عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

قدرِ زائد کا نظریہ

سوال ۱۵:۔ مارکسی فلسفہ میں "نظریۂ قدرِ زائد" سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً واضح کیجئے۔

جواب:۔ مارکسی فلسفے کی پہلی کڑی "تاریخ کی مادی تعبیر" دوسری "طبقاتی کشمکش" اور تیسری "قدرِ زائد" (SURPLUS VALUE) کا نظریہ ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ مارکس کے نزدیک کسی چیز کی اصلی قیمت وہ محنت ہے جو مزدور نے اس کے تیار کرنے میں انجام دی ہوتی ہے۔ چونکہ مزدور بیش قیمت مشینی آلات خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس لئے وہ مجبور ہے کہ کارخانہ دار کے دیئے ہوئے معاوضے کو قبول کرے۔ ایک چیز کی قیمت اصل میں مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اسے "قدرِ زائد" کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ مزدور کا حصہ ہے مگر کارخانہ دار اسے سرمایہ اور قانون کی آڑ لے کر اس سے چھین لیتا ہے۔

بظاہر یہ نظریہ بڑا خوشنما نظر آتا ہے مگر حق کے ساتھ اس میں باطل کی آمیزش بھی کی گئی ہے۔

کسی چیز کی پیدائش میں صرف مزدور کی محنت ہی کام نہیں کرتی بلکہ مشینی آلات، ان آلات کو ایجاد کرنے والا دماغ، کارخانہ دار کا سرمایہ اور محنت وغیرہ سب شامل ہیں۔ بے شک مزدور کو اس کا حق پسینہ خشک ہونے سے پہلے ملنا چاہیئے مگر یہ بھی بعید از انصاف ہے کہ سب کچھ مزدور ہی کو مل جائے لہٰذا اہم بات یہ ہے کہ منافع کی تقسیم عادلانہ ہو نہ یہ کہ مزدور کو اس چیز کا

مالک بنا دیا جائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مارکسی فلسفہ کا یہ نظریہ صرف ظاہری طور پر دلفریب اور پرکشش نظر آتا ہے مگر حقیقت میں مزدور کی بے جا حمایت اور طرفداری کی غمازی کرتا ہے۔

تصورِ ریاست

سوال ۵۲:۔ اشتمالیت کے "تصور ریاست" پر روشنی ڈالیے؟

جواب:۔ مارکسی فلسفہ کی چوتھی بنیادی اینٹ اس کا "تصور ریاست" ہے۔ اس تصور کے اعتبار سے ریاست کی غرض صرف یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار اور برسرِ اقتدار طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرے اور جو مظالم وہ پسماندہ طبقہ پر ڈھا رہے ہیں ان کی قانونی سند جواز عطا کرے۔ اس فلسفہ کی نگاہ میں ریاست کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ وہ برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہے اور غریب طبقہ کے استحصال (EXPLIOTATION) کو قانونی حیثیت دے کر ان کے مفادات کو پامال کرتی رہے۔

یہ درست ہے کہ سرمایہ دار اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر سیاسی طاقت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتا ہے اور بسا اوقات اس کی یہ آرزو بر آتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاست بذاتِ خود کوئی بری چیز ہے کسی چیز کا غلط استعمال اور چیز ہے اور اس کا بذاتِ خود مذموم و معیوب ہونا چیزے دیگر۔ تاریخ عالم اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ دنیا میں ایسی ریاستیں بھی تھیں جن کو سرمایہ دار طبقہ اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کر سکا۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ریاست کا مقصدِ وجود تو عدل و انصاف کا قیام ہے مگر یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی خود غرضی کی بنا پر بعض اوقات اسے ظلم و تعدی کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست برسرِ اقتدار طبقہ

کے مفادات کے تحفظ کیلئے وجود پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا اولین مقصد انسانی طبقات میں مساوات پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ خلیفۂ اوّل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پہلا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ "اور تم میں جو کمزور ہیں وہ میرے نزدیک طاقتور ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں۔ اور تم میں جو طاقتور ہیں وہ میرے نزدیک کمزور ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول نہ کر لوں۔"

خلافتِ راشدہ کا تذکرہ دورِ اشتمالی فلسفہ کے اس نظریہ کی تردید و تکذیب کیلئے کافی ہے کہ ریاست کا مقصد وجود ہی برسرِ اقتدار طبقے کی حمایت اور کمزور طبقہ کے حقوق کی پامالی ہے۔

سوال ۵:۔ اشتمالی طبقہ کی رُو سے کمیونزم کے مقاصد اور انہیں حاصل کرنے کے بنیادی ذرائع کونسے ہیں؟ یہ بھی بتائیے کہ یہ فلسفہ مقاصد کی تحصیل میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے

جواب :۔ قبل ازیں اشتمالی فلسفہ کے بنیادی تصورات بیان کئے گئے ہیں۔ ان تصورات پر اشتمالی تحریک کی جو عمارت استوار کی گئی اسکو اپنانے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو قوم بھی اسے قبول کرے گی اسے دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اشتمالی تحریک کے قائدین کی نگاہ میں اسکے مقاصد حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ اس میں لوگ مختلف طبقات میں تقسیم نہیں ہونگے۔

۲۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ظلم و تعدی کا شکار نہیں بنا سکے گا۔

۳۔ معاشی عدل و انصاف کے باعث معاشرتی مساوات ختم ہو جائے گی۔

۴۔ ریاست جو ظلم و جبر کا سب سے بڑا ادارہ ہے ختم ہو جائیگا۔

اشتمالیت جن ذرائع سے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے بنیادی اصول یہ ہیں :۔

بنیادی ذرائع

۱۔ انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

۲۔ جماعت کو دولت اور ذرائع دولت پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

۳۔ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا نظام جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ اور اس

کی جانب سے حکومت یہ کام انجام دے ۔

تحصیلِ مقاصد میں اشتمالیت کی کامیابی یا ناکامی :- اشتمالیت نے جس جنتِ ارضی کے سہانے خواب دیکھے تھے وہ آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے نہ معاشی مساوات قائم ہو سکی اور نہ ریاست کا وجود ناپید ہو سکا۔ ہوا صرف یہ کہ ظالم سرمایہ داروں کی کرسی ظالم کیمونسٹ پارٹی نے سنبھال لی ۔ جدید بسیار کے باوجود انفرادی ملکیت تاہنوز باقی ہے۔ طبقاتی تقسیم کو مٹانے کے لئے بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تھے مگر عملی طور پر ایسا نہ ہو سکا۔ طبقاتی تقسیم کے مظاہر زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتے ہیں۔ تنخواہوں میں مساوات قائم نہ ہو سکی ۔ مختلف طبقات کے مشاہروں میں بہت فرق پایا جاتا ہے ۔

انفرادی ملکیت کو ختم کرنے اور ذرائع پیداوار کو پارٹی کی ملکیت بنانے کے لئے جس قدر خون خرابہ سے کام لیا گیا اس کا اندازہ بقول مسٹر جان ڈین ہرڈ کے یہ ہے روس میں معاشرہ کے مختلف طبقوں کے لوگ مندرجہ ذیل تعداد میں قتل ہوئے ۔

طبقات	مقتولوں کی تعداد
پادری	۳۱
چرچ کے خادم	۱۵۰۶۰
جج ، وکیل اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
طالب علم اور استاد	۱۹۳۶۷
سول ڈیفنس کے افسر	۷۹۹۰۰
معززین کرام کے لوگ	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
عام مزدور	۱۹۶۰۰۰

ملاح اور سپاہی	۳۶۰۰۰
کسان	۸۹۰۰۰

(بحوالہ ڈیلی گزٹ کراچی ۲۶؍ جون ۱۹۴۴ء)

ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ اشتمالیوں نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے جو مظالم روا رکھے وہ تاریخ کے انتہائی مظالم سے کہیں زیادہ تھے اور چنگیز و ہلاکو کی ستم گری اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اشتمالیت جن مقاصد کا دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔ اگر وہ پورے ہو جاتے تو بھی یہ ظلم و تشدد گوارا کر لیا جاتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دینا اصل مقصد نہ تھا بلکہ حصولِ نصب العین کا ایک ذریعہ تھا۔ اصل مقصد طبقاتی امتیاز کو مٹانا تھا وہ اب بھی باقی ہے۔ فرانس کا ایک اشتمالی مصنف لکھتا ہے۔

"روس میں طبقاتی تقسیم پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ میاں امراء و غرباء اور غالب و مغلوب سب موجود ہیں۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ ریل کے ڈبوں، جہازوں اور ریستوران میں مختلف درجوں کا پایا جانا طبقاتی تقسیم کی بین دلیل ہے۔"

طبقاتی تقسیم کا اندازہ تنخواہوں کے اس تفاوت سے بھی ہوتا ہے جو روس میں ہر جگہ عام ہے۔ ایک عام مزدور کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۴۰۰ روبل ماہانہ ہے جبکہ ایک منیجر کو ۳۰ ہزار روبل ماہانہ ملتے ہیں۔ تنخواہ میں اتنا نمایاں فرق دوسرے ممالک میں بھی نہیں ہے۔

اشتمالی لیڈر بڑے وثوق کے ساتھ روس کی قومی آمدنی میں اضافہ کے اعداد و شمار گناتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس اضافہ میں کتنے بے گناہوں کا خون شامل ہے۔ روس کے اکثر بڑے منصوبے جبری محنت کا نتیجہ ہیں۔ ایک مشہور کتاب میں تھے آنار کا

انتخاب کیا" کا مصنف جو پہلے اشتمالی خیالات رکھتا تھا لکھتا ہے۔
ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں برابر اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ سرکاری حلقوں کا بیان ہے کہ یہ فوج کروڑوں سے بھی زیادہ تھی"۔
یہ وہ لوگ تھے جن پر غدارِ وطن اور اشتمالیت دشمن ہونے کا شبہ تھا۔ ایسے افراد کو پکڑ کر سائبیریا بھیج دیا جاتا جہاں ان سے صبح چار بجے سے شام کے سات بجے تک کام لیا جاتا۔
اگر ان بیانات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو قومی آمدنی میں اضافہ تو ہر جگہ ممکن ہے۔ اس کے لئے نہ اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے اور نہ جبر و تشدد کی جاپان اور جرمنی نے اشتمالیت کے بغیر جو معاشی ترقی کی وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔

مغربی تہذیب کا مستقبل

سوال ۵۴:۔ مغربی تہذیب کے محاسن و معائب قلمبند کیجئے اور بتائیے کہ اس کے مضرات سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟

جواب:۔ مغربی تہذیب کی برائیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر یہ تہذیب معائب و نقائص کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں چند خوبیاں بھی رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام شر محض کے بل بوتے پر نہ رائج ہوسکتا ہے نہ مقبول۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جاسکتا ہے مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اس مادی تہذیب سے انسانیت کو حسب ذیل فوائد پہنچے ہیں۔

۱- اس تہذیب نے عقل انسانی کو ایک فرسودہ اور کہن مذہب کے پیچھے سے رہائی دلائی۔

۲- اس تہذیب نے انسانی عقل کو غور و فکر پر آمادہ کیا۔

۳- اس تہذیب نے دلوں سے جہالت کے پردے چاک کر کے انہیں تحصیل علم اور جدوجہد پر ابھارا۔ اس طرح تعطل و جمود کی جگہ حرکت و حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنایا اور قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے پوری زندگی کو متاثر کیا۔

جدید تہذیب کے معائب:-

تہذیب جدید نے انسانیت کو جو فوائد پہنچائے تھے ان سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا۔ اہل یورپ نے عقل پر سے مذہب کی جو پابندی اٹھائی تھی اس نے عقل انسانی کو شتر بے مہار بنا دیا۔ دنیا میں آج جس قدر فکری اور عملی بے راہروی پائی جاتی ہے وہ سب عقل کی اسی بے لگامی کا نتیجہ ہے۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ مادی سروسامان کی فراوانی کے باوجود انسان سکون و اطمینان کی دولت سے کیوں محروم ہے۔ غلہ کثرت سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود نوع انسانی بھوک کا شکار ہے۔ سائنس نے مناظر قدرت کو مسخر کر لیا ہے مگر انسان کو سکون سے آشنا نہیں کیا۔ انسان قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا لیکن خود اپنے ہاتھوں تیار کردہ آلات جنگ سے کروڑوں انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیتا ہے عقل یہ دیکھ کر حیران ہے کہ اس کی منزل جو اسے قریب دکھائی دیتی تھی ہنوز اس سے بہت دور ہے۔ انسان آج بھی مظلوم ہے۔ عدل و انصاف کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں۔ دھوکہ و فریب کی گرم بازاری ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و استبداد کی فراوانی ہے۔ یہ درست ہے کہ آج کے انسان نے مناظر فطرت کو

مسخر کر لیا۔ بحر و بر پر قابو پا لیا۔ ملکوں اور شہروں کے ڈانڈے ملا دیئے۔ مگر ان چیزوں میں سے کوئی بھی بذاتِ خود مطلوب نہیں۔ یہ سب چیزیں امن و سکون اور طمانیت قلب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ جب اس مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہیں تو سب بے کار ہیں۔

جدید تہذیب کے ہولناک نتائج دیکھ کر خود اہل مغرب بھی پریشان ہیں۔ مشہور ماہر عمرانیات پروفیسر سارو کن اپنی مشہور کتاب "ہمارے زمانے کا بحران" (THE CRISIS OF OUR AGE) میں لکھتے ہیں۔

"تدریجی شہادتوں کے پیش نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ ہماری تنظیم اور ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گزر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں"۔

تاریخ کے مشہور عالم پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن بی تہذیب جدید پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤ بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ بڑا خطرناک مرحلہ ہے۔ وہ بازی لگانا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسہ نہیں جن کے بل پر اس کی کامیابی ہو"

وہ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں۔

"اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی تمام مساعی ناکام ہو چکی ہیں ہمارے تمام بلند بانگ دعوے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ دورِ حاضر کی سب سے

بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیاء ہے۔"

صرف دین اسلام ہی قابلِ قبول ہے:۔

تاریخ عالم کے فاضل یگانہ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی نے فوق الطبعی ایمان کی ضرورت و اہمیت کا جو اعتراف کیا ہے یہ ان کی منفرد رائے نہیں بلکہ یہ وہ رجحان ہے جو یورپ میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کوئی کتاب کسی رسالہ کے اوراق اس حقیقت کے ذکر و بیان سے خالی نہیں ہیں۔ اس دور میں انسانی مذہب کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کا سائنٹیفک ذہن صرف اسی مذہب کو قبول کر سکتا ہے جو عقل انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ جو غیر فطری عبادات و اعمال کا تقاضا نہ کرتا ہو۔ جو وہم و تعصب کی پیداوار نہ ہو۔ حق یہ ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ بدھ مت کی حیثیت ایک ضابطۂ اخلاق سے زیادہ نہیں۔ ہندو مذہب مجموعۂ توہمات ہونے کے علاوہ انسان کو آواگون کے غیر عقلی چکر میں گرفتار کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دونوں مذہب مواعظ و نصائح سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی کا کوئی عملی نظام پیش نہیں کرتے عیسائیت نے تو خود دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی دوئی کو قبول کر لیا ہے یہودیت ایک نسلی مذہب ہے اور بس۔

خلاصہ یہ کہ انسانیت کی فوز و فلاح صرف اسلامی نظام حیات کو اپنانے میں مضمر ہے۔ اسلام دراصل وقت کی پکار ہے۔ دورِ حاضر کے امراض کا علاج ہے۔ پریشان انسانیت کے لئے وجہ سکون ہے۔ اصلی اور ابدی مسرت کا پیغام ہے۔ اب مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی سیرت و کردار کو اسلامی سانچہ میں ڈھالے۔ تمام شعبہ ہائے حیات کو اسلامی نظام زندگی کے تابع رکھ کر امامت اقوام کا منصب حاصل کرے۔ مگر وہ ایسا کر سکا تو کائنات کی سب

تو تیں اس کارِ خیر میں اس کی رفیق ہوں گی اور اسے پکار پکار کر کہیں گی :-

اٹھو کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

حصہ سوم

اسلام کا نظام حیات

نوٹ: ۔ حصہ دوم پنجاب یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصاب برائے بی۔ اے سے خارج ہے
نیز حصہ سوم کے صرف ابواب ۱۳ ، ۱۷ ، ۱۸ اور ۱۹ شامل نصاب ہیں۔

اسلامی نظامِ حیات

تعارف

سوال ۵۵: اسلام میں فرد اور جماعت کے درمیان کس قسم کا ربط و تعلق پایا جاتا ہے؟

جواب: اسلام کا مقصد نفس انسانی کی اصلاح ہے وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرتا ہے اور خدا، رسول اور یوم آخرت پر ایمان کے ذریعہ کائنات اور اس کی حقیقتوں اور زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے توحید، رسالت اور آخرت وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا پورا نظام قائم ہے۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو انہی بنیادوں سے وابستہ ہے۔

اسلام نے فرد اور جماعت دونوں کے حقوق و فرائض متعین کئے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کو شریعت کی زبان میں حقوق العباد کہتے ہیں۔ یہ حقوق و فرائض کئی طرح کے ہیں مثلاً ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق۔ فرد اور معاشرے کے باہمی روابط ان انفرادی و اجتماعی مسائل و حقوق کے لئے دین اسلام میں ایک جامع قانون موجود ہے۔ اسلام نے حقوق العباد کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اسے حقوق اللہ سے بھی مقدم ٹھہرایا ہے دین اسلام میں حقوق العباد اور باہمی معاملات سے متعلق تفصیلی احکام ملتے ہیں۔ باہمی معاملات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے دین حق نے خاموشی اختیار کی ہو یا اس کے بارے میں ناقص ہدایات دی ہوں۔

انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مہد سے لحد تک اسے

انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ اس دنیا میں آتا ہے تو دو انسانوں کے اجتماعی تعلق سے ۔ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اور تربیت کے مراحل طے کرکے پروان چڑھتا ہے ۔ احباب میں بیٹھتا اٹھتا اور ہر طرف سیر و گردش کرتا ہے۔ ہر قدم پر دوسرے انسانوں سے ملنا جلنا ہے۔ تعلیم ہو یا معاش ہر میدان میں اسے معاشرہ اور ریاست کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی انسانوں کے ساتھ ملنے جلنے اور لین دین کرتے گزر جاتی ہے۔

اسلام انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ فرد کو کامل آزادی دیتا ہے۔ لیکن جب یہ آزادی دوسروں کے حقوق پر اثر انداز ہوتی ہے یا اس سے نظم جماعت کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ فرد پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ بے شک حکومت ان حدود و قیود کو نافذ کرنے میں مدد دیتی ہے لیکن اسلام حکومت کی طاقت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ایمانی و اخلاقی حس کو بھی بیدار کرتا جاتا ہے تاکہ مجبور و محکوم ہونے کے بجائے افراد بخوشی خاطر اسلامی قوانین کو خوش آمدید کہیں۔ اسلامی قوانین فرد اور جماعت دونوں کی عزت و آبرو اور امن و آسائش کے کفیل ہیں۔ اسلامی معاملات کی اصل و اساس احترام انسانیت ہے جس میں عدل و مساوات کی روح کارفرما ہے۔

دین اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے جس میں فرد اور جماعت کے جملہ مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ عائلی مسائل کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے اور معاشرتی گتھیوں کو بھی سلجھاتا ہے۔ معاشی مسائل ہوں یا سیاسی کوئی بھی اس کے دائرہ کار سے خارج نہیں۔ لیکن ان سب میں اس کا مخصوص زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ تمام معاملات خدا کی اطاعت، اخلاقی اصولوں کی برتری، احترام انسانیت اور دوسروں کے حقوق کی نگہبانی کی روشنی میں طے ہوں۔ اسلام جملہ شعبہ ہائے حیات کے لئے بنیادی اور اصولی تنظیم

دیتا اور ایسی حدود قائم کرتا ہے جن کو کسی قیمت پر بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ بنیادی اصولوں کے تعین اور حدود کے تقرر کے بعد وہ انسان کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات کے مطابق اپنی راہ متعین کرے۔ اسلام میں ارتقاء کے مواقع موجود ہیں اور خدا کی اطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے انسان ترقی کی ہر منزل کو چھو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین اسلام جمیع شعبہ ہائے حیات کے لئے احکام و ضوابط دیتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی نگاہ سے پنہاں نہیں ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اسلامی قوانین ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے اور ایک انسان اطاعت خداوندی کی حدود میں رہ کر دنیوی ترقی کی سب منزلیں طے کر سکتا ہے۔

سوال ۵۶: لفظ شریعت کی تشریح کیجئے نیز بتائیے کہ اسلامی شریعت کے مصادر و مآخذ کیا ہیں؟

جواب: اسلامی نظام زندگی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اسلامی شریعت کے مآخذ و مصادر کا جاننا ضروری ہے۔ اسلام زندگی کا جو لائحہ عمل متعین کرتا ہے وہ صرف انسانی عقل و تجربہ پر مبنی نہیں بلکہ وہ براہ راست خدا کی کتاب اور حدیث نبوی سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ چونکہ اسلامی نظام زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد وحی الٰہی پر رکھی گئی ہے اس لئے نظام زندگی کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل اسلامی شریعت کی حقیقت کو سمجھنا اور تفصیلاً یہ جاننا ضروری ہے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں وہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں۔

مصادر و مآخذ

۱۔ قرآن کریم:

۲: حدیث نبوی۔

۳: اجماع امت۔

۴: اجتہاد یا قیاس۔

شریعت کا مفہوم: لفظ شریعت (شَرِیْعَۃٌ اور شَرْعٌ) کے لغوی معنی گھاٹ، روشن، سیدھے اور صاف راستہ کے ہیں۔

مذہبی اصطلاح میں شریعت سے وہ قوانین و احکام مراد ہوتے ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس کی بندگی اور فرماں برداری کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان احکام و قوانین میں باہمی معاملات یعنی دین، نکاح و طلاق، خرید و فروخت حلال و حرام اور لوگوں کے حقوق و فرائض سب شامل ہوتے ہیں۔ اسلام نے ہمیں بتایا کہ دین یعنی نظامِ زندگی تو ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایک ہی رہا لیکن تغیراتِ زمانہ کے پیش نظر شریعت (قوانین و احکام) بدل جایا کرتی تھی۔ دین کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے

شریعت کے متعلق ارشاد ہوا

لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْہَاجًا — تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔

ان آیات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دین ایک ناقابلِ تغیر چیز ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے اندر مختلف شریعتیں بھیجی تھیں۔ ہر نبی اپنی اپنی قوم کو الگ الگ تہذیب و اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی زمانہ میں متعدد انبیاء جداگانہ علاقوں میں دعوت و ارشاد کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ جب انبیاء کی تبلیغ سے انسانی شعور میں پختگی و بیداری کے آثار نمودار ہوئے جغرافیائی حدود کے کم ہو جانے سے کائناتِ ارضی کے ڈانڈے مل گئے اور ساری دنیا

ایک آبادی بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الرسل والانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کے لئے رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ وہ نظامِ زندگی لائے جو تمام بنی نوعِ انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اب انہی کی اطاعت سے خدا کی رضا جوئی ممکن ہے۔

بنابریں سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بلاشبہ اسی دین کے داعی تھے جس کی تبلیغ حضرت آدمؑ اور دیگر رسل و انبیاء نے کی تھی۔ البتہ پرانی شریعتیں مرورِ زمانہ سے اس قابل نہ رہیں کہ دورِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ چل سکیں اس لئے منسوخ قرار پائیں اور ان کی جگہ ایسی شریعت نے لی جس میں رہنمائی کی گئی تاکہ تمام انسانوں کے لئے عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین یکساں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الٰہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا ہے۔ علمائے کرام نے شریعت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"القانون الالٰهی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم العقائد والاعمال وتهذیب الاخلاق وتدبیر المنزل وسیاسة المدن"	شریعت خدا کا وہ قانون ہے جو عقائد و اعمال کی درستی اخلاقی اصلاح خانگی زندگی اور ملکی سیاست کو سنوارنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے

شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری

سوال ۷۵ : مسلم معاشرہ کی تشکیل کے اصول و قواعد بیان کیجئے اور بتایئے کہ اسلامی شریعت کا مقصد کیا ہے؟

جواب : **مسلم معاشرہ کی تشکیل**

اسلام کے لفظی معنی ہیں گردن جھکانا، سرِ نیاز خم کر دینا، جو شخص اطاعت کا فعل انجام دیتا ہے وہ مسلم کہلاتا ہے۔ اسی طرح جو معاشرہ بخوشی خاطر اپنی زندگی کے تمام امور میں خداوندی احکام پر عامل ہو اور رضائے الٰہی کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار ٹھہراتا ہے اسے مسلم معاشرہ کہتے ہیں۔ مسلم معاشرہ کے افراد تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے اور زندگی کے مسائل کو اس کی دی ہوئی روشنی و ہدایت میں طے کرتے ہیں۔ اطاعت خداوندی ایسے تمام لوگوں کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دیتی ہے اور ان کے اجتماع سے ایک مسلم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ مسلم معاشرہ کی عظیم خصوصیت جو اسے دوسرے معاشروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہ معاشرہ اپنے ارادہ و اختیار سے احکام خداوندی کو اپناتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ معاشرہ ایک معاہدہ کی بناء پر معرضِ ظہور میں آتا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بندے اس معاہدہ میں یہ طے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا حاکم مطلق ہے۔ اس کی رہنمائی اُن کے لئے ایک واجب الاطاعت قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اچھی بات وہی ہے جسے خدا تعالیٰ اچھا کہے اور بری چیز وہ ہے جو خدا کے نزدیک بری ہو۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کی پہچان کے لئے اصل کسوٹی خدا کا قانون ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو دنیا کے کسی معاشرہ میں نہیں پائی جاتیں خواہ اس کے دعاوی کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ خالق و مخلوق کے اس معاہدہ کی اساس پر جو سوسائٹی تشکیل پاتی ہے وہ اقرار کرتی ہے کہ تمام شعبہ ہائے حیات کو دینِ حق کے تابع کرے گی۔ اس کے لئے کتاب الٰہی اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں قرآن و حدیث کے بیان کردہ ضابطۂ حیات کو "شریعت" کہا جاتا ہے۔ مسلم معاشرہ اپنے اقرار کی بناء پر معاملات زندگی کو اس اسکیم کے مطابق چلانے کا پابند ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کا مقصد: ہر نبی کے زمانہ میں جو شریعت بھی تھی اس کا مقصد "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ بعثت محمدیہ کا مقصد وجود بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔

تم بہترین جماعت ہو جس کو لوگوں کے نفع کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ہے تم نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے

ان آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد نیکیوں کا پھیلانا اور برائیوں کا مٹانا ہے۔

امر بالمعروف: معروف کے معنی ہیں پہچانی ہوئی چیز یعنی وہ چیز کہ شریعت یا انسانی فطرت جس کو نیکی کی حیثیت سے جانتی پہچانتی ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو بھلی لگتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ شریعت انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔

نہی عن المنکر: منکر اجنبی، بے گانہ اور بے پہچان چیز کو کہتے ہیں۔ منکرات

سے مراد وہ امور واشیاء ہیں جن کو انسانی فطرت اور دین اسلام نیکی ہونے کی حیثیت سے نہیں پہچانتے۔ یہ وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے اور انسانی فطرت نے انہیں کبھی بنظر استحسان نہیں دیکھا۔

شریعت کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کی بنیاد معروف پر قائم کی جائے اور امکانی حد تک منکرات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام بھلائیوں کے ساتھ ساتھ ان اسباب و وسائل کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے جن سے نیکیاں پروان چڑھ سکیں اور ان امور سے باز رکھتا ہے جو بھلائیوں کے پھلنے پھولنے میں سدّ راہ ہوتے ہوں۔ اس طرح نیکیوں کے ساتھ ان کے وسائل بھی نیکیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع کو منکرات کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ منکرات کا بھی یہی حال ہے۔ جو چیزیں کسی منکر کو فروغ دیتی ہیں یا اس کے وقوع وظہور یا نشوونما کا ذریعہ ہیں وہ منکرات میں داخل ہیں۔ دین اسلام یہ چاہتا ہے کہ منکر کا کلّی انسداد ہو۔ اس کی پیدائش و افزائش کے اسباب کو روکا جائے۔ اور اگر کسی جگہ یہ پیدا ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا مکمل استیصال کر دیا جائے۔

سوال ۵۸: معروف و منکر کی اقسام بیان کیجئے۔

جواب: اسلامی شریعت میں معروف کی تین قسمیں ہیں۔

معروف کی اقسام: ۱: فرض یا واجب۔

فرض یا واجب وہ حکم ہے جس کی تعمیل مسلم معاشرہ پر لازم ہو اور اس کے متعلق شریعت میں صاف اور قطعی احکام پائے جاتے ہوں۔

۲: مندوب یا مستحب

مندوب یا مستحب ان معروف (نیک) کام کو کہتے ہیں جو شریعت میں پسندیدہ خیال کیا جاتا ہو اور شریعت اسے جاری کرنا چاہتی ہو۔ اس قسم کے بعض احکام شارع صریح الفاظ میں دیتا ہے اور بعض جگہ صرف اشارہ پر اکتفا کرتا ہے۔ اس قسم کے بعض کاموں کا عملاً انتظام کیا جاتا ہے اور بعض کی صرف ترغیب دلائی جاتی ہے تاکہ معاشرہ کے صالح لوگ ایسے کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسے کام اگرچہ فرض یا واجب نہیں ہوتے تاہم یہ اپنے دامن میں لاتعداد مصالح اور فوائد رکھتے ہیں۔ بنابریں شریعت ان کے وقوع یا قیام کو پسند کرتی ہے۔

۳: مباح

دینی اصطلاح میں ہر وہ چیز جس سے منع نہیں کیا گیا مباح ہے۔ یعنی اس کے انجام دینے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ صراحۃً اس کی اجازت دی گئی ہو بلکہ کسی چیز کے بارے میں مخالفت یا حرمت کا نہ ہونا ہی اس کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔ بنابریں دنیا میں مباح چیزوں کی بڑی کثرت ہے۔ ممنوعات جو بہت قلیل ہیں ان کو چھوڑ کر سب کچھ مباح ہے۔ مباحات کے دائرہ میں شریعت نے ہمیں آزادی دی ہے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق اجتہاد سے کام لے کر قوانین و ضوابط بنالیں۔

منکر کی اقسام: منکرات کی شرعاً دو قسمیں ہیں۔

۱: حرام

جس چیز سے پرہیز کرنا شرعاً ضروری ہو اسے حرام کہتے ہیں۔ یہ فرض عین کی ضد ہے۔ حرام کی قطعی مخالفت شریعت میں صراحۃً مذکور ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں حرام سے کنارہ کش رہے۔ اسلام میں محرمات و ممنوعات کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے۔

۲ : مکروہ

مکروہ وہ چیزیں ہیں جن کو شرعاً ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ ناپسندیدگی کا اظہار شارع کبھی صراحتہً کرتا ہے اور کبھی اشارۃً۔ مکروہ کے دو درجے ہیں۔

۱ : مکروہ تحریمی : یہ اگرچہ مکروہ ہوتا ہے مگر اس کی کراہت حرمت کی سرحد کو جا چھوتی ہے۔

۲ : مکروہ تنزیہی : یہ وہ مکروہ ہے جس کی شدت پہلی قسم سے کم ہوتی ہے۔ تاہم اس کے شرعاً ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا اور شریعت کا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اس سے اجتناب بہرحال افضل ہے۔

اسلامی احکام کی ہمہ گیری : اسلامی احکام اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ معروف و منکر، فرائض و محرکات اور مکروہات و مستحبات کی تقسیم زندگی کے جملہ افعال و اعمال میں جاری ہے۔ عبادات و معاملات، سیرت و کردار، اخلاق و عادات، آداب طعام و لباس، خانگی و خاندانی زندگی، معاشی حالات و معاشرتی تعلقات، حکومت و سیاست اور صلح و جنگ کے اصول غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے نیکی اور بدی کے طریقے بھلائی اور برائی کے راستے اور حلال و حرام کے اختیارات ہم پر واضح نہ کر دیے ہوں۔ شریعت ہمیں صاف صاف بتاتی ہے کہ کون سی نیکیاں ایسی ہیں جن کی نشو و نما ہمارے لیے از بس ناگزیر ہے۔ اور کون سی برائیاں اس انداز کی ہیں کہ ان کے استیصال ہی سے معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے۔ اسلام نے زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بحیثیت مجموعی ایک ایسی وحدت ہے جس کا کوئی جزو نہ خارج کیا جا سکتا ہے نہ باہر سے کسی نئے جزو کے گھس آنے کی گنجائش ہے

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ط

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے آؤ۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جمیع شعبہ ہائے حیات کو اسلامی نظام حیات کے سانچے میں ڈھالو اور یوں نہ کرو کہ اس کے کچھ گوشے تو اسلامی حدود کے اندر ہوں اور کچھ اس سے خارج رہ جائیں۔

اسلامی شریعت کے ماخذ

سوال نمبر ۵۹: اسلامی شریعت، فقہ اور اصول فقہ میں کیا فرق ہے؟

جواب:

شریعت

شریعت ان احکام و اصول کو کہتے ہیں جو ایک رسول یا نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لا کر بندوں کو دیتا ہے اور ان سے ان کی اطاعت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس سے ایک رسول اور امام و مجتہد کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بنابریں شریعت محمدی یا شریعت موسوی کہنا اس اعتبار سے بھی درست ہے کہ اس شریعت کے لانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

فقہ: لفظ فقہ عربی زبان میں فَقِهَ يَفْقَهُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی سمجھ سوچ اور فہم و شعور کے ہیں۔ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ "حِكْمَةٌ شَرْعِيَّةٌ عَمَلِيَّةٌ" یعنی فقہ اس علم کا نام ہے جس کا تعلق شرعی احکام سے ہوتا ہے۔ یہ احکام فروعی یعنی اصولی احکام کی فروع یعنی شاخ سے ماخوذ و متفرع ہوتے ہیں۔ یہ سب احکام عملی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں صرف وہی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ جو عمل سے وابستہ ہوتے ہیں۔

اس سے شریعت اور فقہ کا فرق بھی واضح ہوجاتا ہے۔ علم فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے صادر کردہ اور شریعت سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرہ میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فرعی و عملی ہوتے ہیں بخلاف ازیں شریعت کا دامن عقائد و اعمال دونوں کے لئے کھلا ہے لہذا اس میں عقائد و اعمال دونوں شامل ہوتے ہیں۔

فقہ اور شریعت کا یہ فرق اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب ان کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے اس ذوق کو نظر انداز کر کے بعض اوقات مجازاً دونوں کو ایک ہی معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "شریعت اسلامیہ کے مآخذ چار ہیں" تو شریعت سے مراد یہاں فقہ ہے اور اسکا مطلب یہ ہے کہ "فقہ اسلامی کے مآخذ چار ہیں۔ عام گفتگو میں یہ فرق و امتیاز کم ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لئے شریعت کا لفظ بول کر فقہ اسلامی مراد لی جاتی ہے اور فقہ کا لفظ شریعت کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے اصل استعمال کے لحاظ سے شریعت فقہ اور اصول فقہ کے الفاظ جداگانہ مفہوم رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔

اصول فقہ: اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف حسب ذیل ہے۔

"عِلْمٌ بِقَوَاعِدَ يُتَوَسَّلُ بِهَا إِلَى كَيْفِيَّةِ اسْتِنْبَاطِ الْمَسَائِلِ عَنْ دَلَائِلِهَا التَّفْصِيلِيَّةِ"

"یعنی اصول فقہ سے ان قواعد و ضوابط کا علم مراد ہے جن کے ذریعہ مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل سے نکالا جاتا ہے"۔

مندرجہ بالا تعریف سے فقہ اور اصول فقہ کا فرق و امتیاز بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے علم فقہ گویا فرعی و عملی احکام کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ احکام اصول شریعت سے ماخوذ و متفرع ہوتے ہیں۔ علم اصول فقہ میں وہ قواعد بیان کئے جاتے ہیں جن کی رو سے فقہی

احکام کو شرعی اصولوں سے بذریعہ قیاس و اجتہاد استنباط (نکالا جاتا) کیا جاتا ہے
اس اعتبار سے علم فقہ فرعی احکام کا جامع ہے اور اصول فقہ قواعد استنباط کو شامل ہے

ماخذ اول ——— الکتاب

سوال نمبر ۶۰ : اسلامی قانون میں قرآن کریم کو کیا مقام حاصل ہے ؟ دلائل کی روشنی میں بیان کیجئے۔

جواب : قرآن کریم اسلامی قانون کا اولین سرچشمہ اور ماخذ اساسی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اس میں مندرج احکام و فرامین بندوں کے لئے لازم التعمیل ہیں۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا آسمانی ہونا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے مندرجات حق و صداقت کے آئینہ دار ہیں اور اس میں کوئی ایسی بات شامل نہیں ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو۔

قرآن کریم اور دیگر کتب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ان کتب کے معتقدین ان کے آسمانی وا لہامی ہونے کے دعوے دار ہیں مگر یہ کتاب ناطق آگے بڑھ کر خود یہ دعویٰ کرتی ہے کہ

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ"	بلاشبہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے

(السجدہ ۔ ۲)

ارشاد ہوتا ہے۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ	یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ

لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ (ص ــ ۳) کی طرف اشارہ تاکہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔

نیز فرمایا۔

تَنْزِيلًا مِمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاوَاتِ الْعُلَى (طٰہٰ ــ ۴) یہ کتاب زمین و آسمان کے خالق کی نازل کردہ ہے۔

قرآن کریم اسلامی قانون کا مصدر اول ہے۔ اس میں شریعت کے بنیادی اصول و عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب کرہ ارضی پر بسنے والے تمام افراد کے لئے پیغام ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَى إِلَيَّ مِنْ رَبِّي هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (الاعراف ــ ۲۴) آپ فرما دیں کہ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر نازل کی گئی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ہدایات ہیں اور اس میں ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ (الزخرف ــ ۴۴) اور بے شک یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے نصیحت ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (النساء ــ ۱۰۵) بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس طرح فیصلہ کریں جیسے اللہ آپ کو دکھائے

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل

اَقْوَمُ (بنی اسرائیل - ۹) | سیدھی ہے۔

"فَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ" (الاعراف - ۵۲)

بے شک ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم و بصیرت کی بنا پر ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور تفصیلاً بیان کیا ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ (النحل - ۶۴)

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اس لئے اتاری ہے تاکہ آپ ان کے لئے وہ چیز واضح کر دیں جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے

اسلامی قانون کے اعتبار سے قرآن کریم چوں کہ ایک بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ جزئیات و تفاصیل کا حامل نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم جزئیات و فروعات کو بیان کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا تو اس کا حجم اتنا بڑھ جاتا کہ اس کے نقل و حمل میں بڑی دشواری پیش آتی۔ مگر اندریں صورت اس کی اصولی و اساسی حیثیت باقی نہ رہتی۔ بلکہ قرآن ایک فقہ کی کتاب بن جاتا جو تفصیلی احکام و مسائل کو سموئے ہوئے ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اصول اور کلیات کی جامع کتاب ہے اور اس کا مقصد بنیادی اصول و قواعد کو بوضاحت بیان کرنا ہے۔ قرآن کا یہ کام نہیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی قواعد و ضوابط وضع کرے بلکہ اس کے پیش نظر صرف یہ امر ہے کہ انسانی شعبہ ہائے حیات کی تشکیل و تعمیر کس طرز و انداز میں ہونی چاہیئے ان ہدایات کی روشنی میں اسلامی زندگی کے خد و خال کا تعین کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اولین مقصد یہ تھا کہ دنیا کو اس عدیم المثال سیرت و کردار اور اس مثالی معاشرے اور حکومت کا عملی نمونہ پیش کریں

جس کا تصور قرآن حکیم نے دیا ہے۔ کتاب اللہ کا کام انسانی زندگی کی حدود کا تعین تھا اس کے بعد انسانی زندگی کے نقشے کی تزئین و آرائش آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی۔ آپ نے صحابہ کرامؓ جیسے جان نثار اور مخلص مسلمان پیدا کر کے دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام اپنے پیروؤں سے اس قسم کی اسلامی زندگی کا تقاضا کرتا ہے۔

قرآن کا موضوع۔ مقصد اور طرز خطاب

سوال ۱۱؎: قرآن کریم کے انداز خطاب پر روشنی ڈالیے۔

جواب:

طرز خطاب

جس طرح ہر کتاب ایک خاص موضوع پر مشتمل ہوتی ہے اور اس موضوع سے متعلقہ معلومات کو اس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جاتا ہے قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قاری پہلی مرتبہ قرآن کریم کا مطالعہ اس اعتبار سے کرنے بیٹھتا ہے کہ یہ بھی عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے اور اس میں بھی پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل مضمون کو ایک منطقی ترتیب کے مطابق ابواب میں تقسیم کر کے ایک ایک مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائے گی تو اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔

قاری یہ دیکھ کر محو حیرت رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم میں عقائد و اخلاق، شرعی احکام، دعوت و ارشاد، عبرت و موعظت، بشارت و انذار، دلائل و شواہد، تاریخی واقعات اور مظاہر قدرت کا ذکر و بیان بار بار آ رہا ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون شروع ہوتا ہے کہ یکایک ایک بے تعلق مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور انداز تخاطب مختلف سمتوں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ ابواب اور فصول کی کوئی تقسیم نظر نہیں آتی۔

تاریخی واقعات کو تاریخی انداز میں بیان نہیں کیا جاتا۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل کو منطق و فلسفہ کی زبان میں ذکر نہیں کیا جاتا۔ تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے مسائل کو عمرانی نقطۂ نگاہ کے مطابق بیان نہیں کیا جاتا۔ قانونی احکام کا ذکر قانون دانوں کی طرح نہیں کیا جاتا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کتاب کا انوکھا انداز بیان اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تہذیب و ترتیب اس کا رنگ ڈھنگ اور اس کا موضوع و مضمون باقی سب کتابوں سے نرالا ہے۔

اس طرز بیان کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسان کے شعور کلی سے خطاب کرتا ہے اس کے کسی شعبہ یا جز سے نہیں۔ وہ بیک وقت وجدان و عقل پر اثرانداز ہوتا ہے۔ عام مصنفین کا یہ حال نہیں ہے۔ ایک مصنف اپنی تصنیف کے موضوع کو ایک منطقی ترتیب کے ساتھ ابواب میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کے لئے ایک جداگانہ طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ وجدان و کیفیات کا بیان ایک خاص انداز تحریر کا متقاضی ہے اور اس کی ایک خاص ترتیب ہے۔ تاریخ نویسی کے وقت واقعات کی ترتیب و تسلسل کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کو ابواب و فصول میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مگر قرآن کریم کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ اس قسم کی تقسیم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ جو کتاب بہ یک وقت انسان کی شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ ایسی تقسیم کی روادار نہیں ہو سکتی۔ اس چیز نے قرآن کریم کو اپنی ترتیب اور طرز ادا کے اعتبار سے اپنے انداز کی واحد کتاب بنا دیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ قاری پڑھتے وقت جب تک اپنے قلب و ذہن اور ضمیر و وجدان سب کو بہ یک وقت حاضر اور متوجہ نہ رکھے وہ اس سے کامل استفادہ نہیں کر سکتا۔ جداگانہ طرز خطاب اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کو اتارنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے اپنے سینہ

ہیں جگہ دیں، اسے ورد زبان بنائیں، اس سے سکون قلب کی دولت پائیں، نماز میں اس کی تلاوت کریں، دعاؤں میں اس کے کلمات کو دہرائیں۔ اس میں غور و فکر کریں اور اس کے احکام کو اپنا معمول بنائیں۔ اگر قرآن کی ترتیب اور طرز ادا ایک عام کتاب جیسی ہوتی تو یہ مقاصد اس سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

قرآن کریم کا یہ انوکھا انداز خطاب ہی تھا جس نے عرب کے فصحاء و بلغاء اور ادباء و شعراء کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور وہ پکار اٹھے تھے کہ "ما ھذا کلام البشر" (یہ انسانی کلام نہیں) حالانکہ وہ خود صاحب زبان و بیان اور ادیب و خطیب تھے۔ اگر قرآن کا طرز خطاب ایک عام تصنیف جیسا ہوتا تو ان کی حیرانی کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ عرب میں ایسے لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو قرآن کریم کے طرز بیان سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

سوال نمبر ۲۲: قرآن کریم کا موضوع و مقصد کیا ہے؟ تفصیلاً بیان کیجئے۔

جواب: قرآن کا موضوع

قرآن کریم کا موضوع متعین کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں کیا ہے؟ وہ کس لئے دنیا میں آیا ہے، اسکا مقصد حیات کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ انسان اس دنیا پر خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اللہ تعالٰی نے اسے عقل و دانش اور فہم و فراست سے نوازا تاکہ وہ اللہ تعالٰی کی حاکمیت کو تسلیم کرے اور اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی اطاعت بجالائے۔ انسانی زندگی کا مقصد اخروی فلاح و نجات حاصل کرنا ہے۔ اس کے سوا تمام مقاصد بیکار ہیں۔

قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے۔ وہ زندگی جسطرح خود ابدی و دائمی ہے اسطرح اس میں جو آرام و راحت یا الم و رنج ملے گا وہ بھی دائمی ہے۔ اخروی رنج و راحت کا انحصار موجودہ زندگی کے افعال و اعمال پر ہے۔ اگر انسان اس زندگی میں خدا کی اطاعت کرے گا اور اپنے تمام شعبہ ہائے حیات کو اسلامی قانون کے تابع کر دے گا تو وہ آئندہ زندگی میں ہر طرح کی راحت و آرام پائے گا ورنہ بصورت دیگر اخروی زندگی میں الم و رنج کا سامنا کرنا ہوگا اور وہ زندگی سخت ناکامی کی زندگی ہوگی۔

انسانی فلاح و نجات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بھیجا۔ حضرات انبیاءؑ کے سلسلہ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا جو اس خطۂ ارضی پر اولین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے پیغمبر بھی تھے۔ انبیاءؑ مختلف اوقات میں مبعوث ہو کر بنی نوع انسان کو دعوت حق دیتے رہے۔ دنیا میں جب بھی ظلمت و جہالت چھا جاتی اور سابق نبی و رسول کی تعلیمات کو مسخ کر دیا جاتا تو اللہ تعالیٰ کسی اور رسول کو مبعوث کر کے کفر و الحاد کا ازالہ کرتے اور حق کی اصلی راہ لوگوں کو دکھاتے رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مرور زمانہ سے حق مغلوب ہو گیا اور ان کے پیروؤں نے اصلی تعلیمات کو بگاڑ دیا۔ موسوی شریعت پہلے ہی تحریف و اختلاط کا شکار ہو چکی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے سالار رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاءؑ والرسل بنا کر بھیجا اور آپ پر خاتم الکتب (قرآن کریم) ایک آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے نازل کی۔ پچھلے انبیاءؑ کی بگڑی ہوئی امتیں سب آپؐ کی مخاطب تھیں۔ سب کو حق دعوت دینا۔ سب کو خدا کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا اور جو لوگ آپ کی دعوت پر لبیک کہیں، ایک امت مسلمہ کی صورت میں ان کی شیرازہ بندی کرنا آپ کا نصب العین تھا۔ آپ کا مشن ایک ایسی امت کا قیام تھا جو اپنی زندگی میں اسلامی قانون کی پیروی کرے اور دوسری جانب لوگوں کی اصلاح

وفلاح کا بیڑا اٹھائے گا۔ قرآن پاک بس اسی دعوت وہدایت کا کفیل ہے۔ قرآن مجید جو ابدی صداقتیں لایا ہے سرور ایام سے وہ مٹ سکتی ہیں اور نہ انہیں مسخ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم کا مقصد

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ قرآن پاک کا موضوع "انسان" ہے۔ قرآن پاک یہ بتانا چاہتا ہے کہ انسان کا نفع اور نقصان کس چیز میں ہے۔ نیز یہ کہ انسان نے نفسانی جذبات وخواہشات کے زیر اثر خدا اور نظام کائنات، اپنی ہستی اور دنیوی زندگی کے بارے میں جو نظریات قائم کئے ہیں اور ان کی بناء پر جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ خود انسان ہی کے لئے تباہ کن ہے۔ صحیح طرز عمل یہی ہے کہ انسان خلیفہ خداوندی ہونے کے اعتبار سے اپنی زندگی کو اسلامی قانون کے تابع کرے اور خدا کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن رہے جسے "صراط مستقیم" کہا جاتا ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن پاک ایسی کتاب نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیک وقت عطا کر دی۔ اسے عام تصنیفات کی طرح ابواب وفصول میں منقسم بھی نہیں کیا گیا۔ بخلاف ازیں قرآن کریم اپنی طرز کی واحد کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل کی۔ آغاز نبوت میں جن ہدایات کی ضرورت تھی پہلے وہ نازل کیں۔ آغاز نبوت کی ہدایات تین مضامین پر مشتمل ہیں:۔

۱: پہلی قسم کی وہ ہدایات ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عظیم بار امانت کو اٹھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

۲: اسلام کے بارے میں ابتدائی وتمہیدی معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ۔

۳: صحیح طریق کار کی طرف دعوت اور ہدایت کے بنیادی اصول۔

آغاز نبوت میں جو تعلیمات نازل ہوئیں وہ چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہیں جو فصاحت وبلاغت، شستہ وشیریں اور پر تاثیر ہونے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ

ادب و بلاغت کا نادر نمونہ ہیں۔ اور تیر و نشتر کی طرح سخن فہموں کے قلب و ذہن میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب نبوت کا ابتدائی دور گذر گیا تو اللہ تعالیٰ نے پرجوش خطبوں کی صورت میں اپنا پیغام بھیجنا شروع کیا ان میں دریا کی روانی، سیلاب کی سی تندی و تیزی اور آگ کی سی سرعت تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتائے گئے۔ ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا۔ انہیں تقویٰ، فضیلت، اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دعوت دین کے طریقوں سے آشنا کیا گیا۔ کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں سعی و جہد پر آمادہ کیا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو پچھلی قوموں کے انجام سے آگاہ کیا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔

ہجرت کے بعد حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پچھلے انبیاؑ کی امتوں سے سابقہ پڑا۔ پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگین ہو گیا۔ اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ ان ادوار کی خاص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پیغامات مختلف صورتوں میں آتے رہے۔ یہ پیغامات کبھی جوش خطابت سے لبریز ہوتے۔ کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا انداز اختیار کیا جاتا۔ بعض اوقات یہ معلمانہ درس و تدریس اور مصلحانہ افہام و تفہیم کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان آیات میں ہی کو جدید اسلامی ریاست کی تشکیل، انسانی زندگی کے اصول و قواعد، کفار، منافقین اور اہل کتاب سے برتاؤ اور دیگر ہدایات دی جاتی تھیں۔

غرض یہ کہ ضروریات زمانہ کے مطابق قرآن کریم کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تئیس ۲۳ سال کی مجموعی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

سوال ۶۳: نزول قرآن کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں تحریر کیجیے؟

جواب: جس طرح امام رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی و دائمی ہے اور بھی زمان و مکان کی حد بندی میں محدود و مقید نہیں اسی طرح جو کتاب ہدایت آپ پر نازل کی گئی تمام بنی نوع آدم کے لئے تا قیامت پیام رشد و ہدایت ہے۔ قرآن کریم اس آخری مجموعے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول پر آخرت تک کے لئے نازل فرمایا۔

نزول قرآن

قرآن کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا۔ حسب ضرورت کبھی کم کبھی زیادہ کبھی ایک آیت کبھی دو آیتیں کبھی ایک سورت اور کبھی ایک ہی دن میں مختلف سورتوں کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن کریم ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو نقل کر کے اسکا جواب دیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ	انہوں (کفار) نے کہا کہ اس پر قرآن یک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ یہ اس لئے کیا تاکہ تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم

تنبیہ۶: (سورۃ فرقان) نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے۔

نزول قرآن کا مکی دور

نزول قرآن کا زمانہ دو الگ الگ حصوں میں تقسیم ہے جو باہم ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔

پہلا حصہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس میں آپ کا قیام مکہ معظمہ میں تھا۔ یہ کل ۱۲ سال ۵ ماہ اور ۱۳ دن کا عرصہ ہے۔ نزول قرآن کا آغاز ۱۷ رمضان سنہ ۴۱ سن ولادت نبوی سے ہوا۔ سورہ انفال کے مطالعے سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بدر اور آغاز نزول قرآن کا دن ایک ہی تھا۔ غزوہ بدر بھی ۱۷ رمضان المبارک کو وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کا اختتام یکم ربیع الاوّل سنہ ۵۴ سن ولادت پر ہوتا ہے جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس مدت میں قرآن پاک کا جو حصہ نازل ہوا ہے اس کو مکی کہتے ہیں۔ بنابریں مکی سورتوں سے فقط وہ سورتیں مراد نہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں بلکہ وہ سب سورتیں ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں خواہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا کسی اور جگہ۔ جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں انکو مدنی سورتیں کہتے ہیں خواہ وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں یا کسی اور جگہ۔

نزول قرآن کا مدنی دور

نزول قرآن کا دوسرا دور ہجرت کے بعد شروع ہوا یہ کل ۹ سال ۹ ماہ اور ۹ دن کا عرصہ ہے۔ اس کا آغاز یکم ربیع الاوّل سنہ ۵۴ سن ولادت نبوی سے ہوا اور ۹ ذوالحجہ سنہ ۶۳ ولادت نبوی بمطابق سنہ ۱۰ ہجری پر ختم ہو گیا۔ اس مدت میں جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان کو مدنی کہتے ہیں۔ مندرجہ صدر بیان کے مطابق نزول قرآن کی کل مدت ۲۲ سال ۲ ماہ اور ۲۲ دن بنتی ہے۔

مکی و مدنی سورتوں کی خصوصیات

مکی سورتوں میں اسلام کے بنیادی عقائد مثلاً توحید رسالت اور آخرت پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مکی سورتیں عموماً مختصر اور مقفّٰی (ہم وزن) عبارت میں ہیں۔ ان سورتوں میں مشرکین کے غلط عقائد کی تردید، اسلامی عقائد کی تشریح اور ان کی صداقت کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ مکی سورتوں میں اعداء دین کے اعتراضات، اہل کتاب کے شکوک و شبہات انبیائے سابقین کے واقعات۔ اہل ایمان کی کامیابی کے لئے اخلاقی ہدایات۔ صدقہ و خیرات کے فضائل اور ذکر و دعا کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مکی سورتیں اختصار کے باوجود ادب و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ سورتیں اپنی روانی قوت تاثیر، زور بیان اور جوش خطابت میں لاثانی ہیں۔

ہجرت کے بعد جب آنحضورؐ کی مدنی زندگی کا آغاز ہوا تو اسلام مظلوم و محکوم ہونے کی بجائے ایک طاقت بن گیا۔ اب مدینہ میں ایک جدید اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس دور کے تقاضے مختلف تھے۔ اس لئے اب عائلی قوانین جہاد فی سبیل اللہ کے احکام معاشی و اخلاقی احکام اور حلال و حرام کے متعلق مسائل نازل ہونا شروع ہو گئے۔ عبادات و معاملات کی تفصیلات بیان ہوئیں اہل کتاب کے رویہ پر تنقید کی گئی۔ منافقین کی بے ایمانی کا راز طشت از بام کیا گیا صلح و جنگ کے احکام اترے اور اسلامی احکام کی حکمت و مصلحت بیان کی گئی۔

آغاز وحی

قرآن مجید وحی الٰہی ہے۔ وحی کے لغوی معنی "چھپا کر اطلاع دینا" ہیں۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خاص غیبی طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی نبی تک کوئی بات پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی شخص کے غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو قطعاً کوئی دخل نہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کے بعد آپ غار حرا میں تشریف

سے جا کر محو عبادت رہا کرتے تھے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو گھر سے لے جاتے اسی حالت میں ایک دن حضرت جبرئیلؑ آئے اور آپؐ سے کہا اِقْرَأْ "(پڑھیے) آپؐ نے فرمایا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتے نے آپ کو زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ کر کہا "پڑھ" آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ فرشتے نے تیسری مرتبہ پکڑ کر دبایا اور چھوڑنے کے بعد کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ (سورۃ العلق)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

یہ پہلی وحی تھی جو آپؐ پر نازل ہوئی۔ اس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس تھی۔ زندگی کے اس نئے تجربہ سے آپؐ ڈر گئے۔ گھر واپس لوٹے اور حضرت خدیجہؓ سے ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور کہا خدا تعالیٰ آپؐ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل مذہباً عیسائی اور تورات و انجیل کا ماہر تھا۔ اس نے سارا ماجرا سن کر کہا یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ چند دنوں تک رک گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عرصہ میں بہت افسردہ رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

قرآن پاک کی جمع و تدوین اور حفاظت

سوال ۱۰ : حفاظت قرآن پاک پر ایک جامع نوٹ لکھئے اور ثابت کیجئے کہ قرآن پاک اپنی اصلی صورت میں محفوظ ہے۔

جواب : قرآن کریم کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ چودہ صدیاں گذرنے کے باوجود یہ اسی طرح محفوظ ہے جیسے عہد رسالت ﷺ میں تھا۔ حالانکہ سابقہ آسمانی کتب کی شکل و صورت اور اصلیت بالکل بدل گئی ہے۔ اس کے محفوظ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک تنہا ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے محفوظ ہونے کا دعویٰ کرتی اور ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ اس کے نازل کرنے والے نے اس کی حفاظت کی ضمانت لی ہے۔ دوسری کوئی کتاب اس خصوصیت میں قرآن کریم کی سہیم و شریک نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹) — بیشک ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیامہ) — بیشک اس قرآن کو جمع کرنا اسے پڑھوانا اور پھر اس کی تشریح و توضیح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت اور جمع قرآن کے ساتھ ساتھ پیغمبر سے اس کے مجمل و مبہم حصوں کی تشریح و تفسیر بیان کروانا بھی اپنے ذمہ لیا ہے لہٰذا قرآن پاک کے اجمالی حصوں کی سب سے معتبر تفسیر وہی ہوگی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔ حفاظت کا وعدہ اس قدر مستحکم بنیادوں پر کیا کہ باطل کی دخل اندازی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰم السجدۃ-۴۲) — قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ پر جو قرآن اتارا گیا ہے یہ بالکل وہی ہے جو اس کی علم محفوظ میں ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (البروج — ۲۲)

بلکہ وہ تو بلند و برتر قرآن لوحِ محفوظ میں ہے۔

قرآن کریم کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی جمع و ترتیب اور حفاظت و کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ شروع ہوا اور آخری مرحلہ تک جاری رہا۔ قرآن کریم کے عین برخلاف سابقہ آسمانی کتب عرصۂ دراز تک زبانی یادداشتوں گیتوں اور قصوں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم سورۂ بقرہ کے شروع میں اعلان کرتا ہے کہ

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

یہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج طویل و عریض کائناتِ ارضی پر قرآن کریم کا صرف ایک ہی نسخہ پایا جاتا ہے جس میں زیر و زبر اور تشدید و مد تک کا فرق موجود نہیں۔ جس زبان میں قرآن پاک اترا وہ ایک زندہ زبان ہے اور کروڑوں انسان اس کو بولتے لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیا میں قرآن پاک کے لاکھوں حافظ موجود ہیں۔ اگر کوئی دشمن اسلام قرآن پاک کے سب نسخے تلف کرنے کی حماقت کا مرتکب ہو تو حفاظ قرآن کے سینہ میں جو کتاب محفوظ ہے اس کو مٹانے پر قادر نہ ہوگا۔ مسلمان اس کو حرزِ جان بنا کر رکھتے اور اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھانے کو عین سعادت تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن پاک واحد کتاب ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی ہے اور جس پر گردشِ ایام کا کچھ اثر بھی ظاہر نہیں۔ اقوام عالم اپنی کتابوں کو لاکھ آسمانی کہیں اور ان کی تعریفوں کے پل باندھیں مگر وہ یہ دعویٰ کرنے سے قاصر ہیں کہ ان کی آسمانی کتب تغیر و تبدل سے محفوظ ہیں۔

سوال ۶۹: قرآن کریم کی جمع و تدوین اور ترتیب کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہوں تحریر کیجئے!

جواب: عہد رسالت میں حفاظت و جمع قرآن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کچھ حصہ نازل ہوتا تو آپؐ صحابہؓ کو سنا دیا کرتے تھے۔ صحابہؓ آپؐ سے سن کر اسے یاد کر لیتے تھے۔ عہد رسالتؐ میں بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جنہیں پورا قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فوراً اسے لکھوانے کا اہتمام کرتے تھے۔ اس غرض سے آپ نے بہت سے کاتب مقرر کر رکھے تھے۔ جن کے نام عام طور سے معروف ہیں۔ بعض علماء نے ان کی تعداد ۲۶ بتائی ہے۔ علامہ حلبی نے سیرت العراقی کے حوالے سے ان کی تعداد ۴۲ لکھی ہے۔ خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی کاتبین وحی میں شامل ہیں۔ کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرے سے کام لے لیا جائے۔ ایک صحابی حنظلہؓ بن ربیع تمام کاتبوں کے افسر تھے۔ ان کو یہ حکم تھا کہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں، تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلمبند ہو جاتی تھی۔ دو شنبہ ربیع الاول ۱۳ نبوی کو آیت یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ نازل ہوئی۔ یہ دوسری وحی تھی پنج شنبہ کو خالدؓ بن سعید اسلام لائے۔ ان سے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ آیت لکھوائی۔ ان کی بیٹی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ میرے باپ نے لکھی۔ اس طرح نزول وحی سے جو تھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام آنحضورؐ کو قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ آپؐ کاتبوں سے لکھواتے۔ جب کاتب لکھ لیتا تو آپؐ پڑھوا کر سنتے۔ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپؐ درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا

تب آپؐ اس کی عام اشاعت کرتے۔ پھر جو صحابہؓ لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضورؐ مجھ کو بلا لیا کرتے تھے۔ میں تختی اور دوات لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ آپؐ لکھاتے۔ لکھا کر پھر سنتے اگر غلطی ہو جاتی تو صحیح کرا دیتے تھے۔

اس زمانہ میں سامان کتابت کا فقدان تھا۔ لکھنے کے لئے کھجور کے چوڑے پتے۔ شانے کی ہڈی۔ ہرن کی جھلی وغیرہ استعمال ہوتی تھی۔ پھر آپؐ اس تحریر کو مسلمانوں میں پھیلاتے وہ اس سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔ جن چیزوں پر کلام الٰہی تحریر ہوتا تھا۔ صحابہؓ دنیا کی ہر قیمتی چیز سے ان کو بیش قیمت خیال کرتے اور انہیں حرز جان بنا کر رکھتے تھے مخصوص کاتبان وحی کے علاوہ بہت سے صحابہؓ نے اپنے طور پر قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عہد نبویؐ میں سارا قرآن مجید جمع کیا تھا اور رات بھر پڑھتا رہتا تھا۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ میں ختم کرنے کا حکم دیا۔ (مسند احمد و نسائی)

جب آپؐ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو مسجد نبویؐ میں ایک صندوق رکھوا دیا جس میں قرآن پاک کا ہر نیا نازل شدہ حصہ لکھوا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ تمام مسلمان اس سے اپنے لئے نقل کرتے رہتے تھے۔ اس طرح آپؐ کی وفات ۱۱ھ تک قرآن پاک کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو تحریری صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود نہ ہو۔ البتہ یہ ایک کتاب کی صورت میں مرتب نہ تھا بلکہ اس کے اجزا منتشر تھے۔

ترتیب سُوَر و آیات

مذکورہ صدر احتیاط و انتظام کے ساتھ قرآن کریم اپنی پوری مدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا۔ آیات و سُوَر کی جمع و ترتیب کا کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی اپنی نگرانی میں مکمل کرایا چنانچہ پورا قرآن پاک موجودہ ترتیب کے ساتھ عہد

رسالتؐ میں جمع ہوگیا۔ اسی ترتیب سے آپؐ رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن پاک کا دور کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری سال یہ دور دو مرتبہ کیا۔ آپؐ نماز میں اسی ترتیب سے پڑھا کرتے تھے اور ہزاروں صحابہ سنا کرتے تھے۔ اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع کردہ قرآن میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

چنانچہ مولانا بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں رقمطراز ہیں۔

قرآن پاک کی موجودہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔

شیعہ عالم کی شہادت

مشہور شیعہ عالم سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں شیعہ مجتہد علامہ سید مرتضیٰ سے نقل کرتے ہیں۔

"قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا اور اس وقت بھی اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔ قرآن اسی طرح سے یاد کیا گیا اور رسولؐ خدا کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپؐ کے سامنے پڑھا جاتا تھا صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت نے متعدد مرتبہ حضورؐ کو پورا قرآن اسی طرح سنایا۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا۔"

مستشرقین کا اعتراف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری نسخہ قرآن کے علاوہ بہت سے صحابہؓ کے پاس پورا قرآن پاک مکتوبہ صورت میں موجود تھا۔ بہت سے صحابہؓ کے پاس قرآن پاک کے تحریری اجزا تھے۔ یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ مستشرقین تک اسکا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ سر ولیم میور نے لکھا ہے۔

"یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ رسولؐ کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہؓ کے پاس موجود تھے۔ اور ان میں پورا قرآن یا تقریباً پورا قرآن لکھا ہوا تھا۔"

ڈاکٹر ہرٹوڈیل لکھتا ہے:۔

"قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسولؐ میں عام طور پر زیر استعمال تھے"

حفاظ قرآن صحابہؓ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد صحابہ کے پاس قرآنی آیات پر مشتمل نوشتے موجود تھے۔ عہد رسالتؐ میں آیتوں اور سورتوں کی ترتیب و تہذیب کا کام مکمل ہو چکا تھا اس لئے برملا یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں سورت کتنی آیات پر مشتمل ہے اور فلاں آیت کا یہ نمبر ہے۔ یہ ترتیب حفاظ قرآن کے سینوں میں محفوظ تھی۔ عہد رسالتؐ میں متعدد صحابہؓ ایسے تھے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا مثلاً

حضرت معاذ بن جبل۔ حضرت ابی بن کعب۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سالم بن معقل۔ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ بہت سے صحابہؓ کو قرآن پاک کے اکثر حصے یاد تھے۔

امام ابن حزم کا بیان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں جو وسعت ہوئی وہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق مختصراً حسب ذیل ہے۔ امام مذکور نے اپنی کتاب "اَلْفِصَل بَیْنَ الْمِلَل وَالنِّحَل" میں جو کچھ لکھا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تمام جزیرہ عرب مسلمان ہو گیا تھا۔ جزیرہ عرب مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے گذرتا ہوا مشرق میں بحر فارس پر ختم ہوتا ہے اور بحر فارس سے دریائے فرات تک سے گذرتا ہوا شام کے کنارے بحر قلزم تک پہنچتا ہے۔ اس جزیرہ میں بے شمار بلاد و قصبات ہیں جو سب مشرف با سلام ہو

گئے تھے۔ عرب بھر میں کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو۔ ان مساجد میں پانچوں وقت
نماز میں قرآن پاک پڑھا جاتا تھا۔ مسلمان اپنے بچوں اور اپنے متعلقین کو قرآن پاک پڑھاتے
تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اڑھائی سالہ عہد خلافت میں فارس و روم اور یمامہ فتح
ہوئے اور اب قرآن پاک کو پڑھنے والے اور زیادہ ہو گئے کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں قرآن
پاک کے متعدد نسخے موجود نہ ہوں۔ فاروق اعظمؓ کی خلافت میں فتوحات کا دائرہ اور وسیع
ہوا اور تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں ہر ہر قریہ میں قرآن پاک کے نسخے موجود تھے
ہر بستی میں اصحاب علم قرآن پڑھاتے تھے۔ تدریس قرآن پاک کے لئے ہزاروں مدرسے
بنائے گئے۔ اسطرح لاتعداد قرآن پاک لکھے گئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں دس سال
اور چند مہینوں تک یہی عالم رہا۔ خلافت فاروقی میں مصر و عراق اور شام و یمن میں کم از کم
قرآن کے ایک لاکھ نسخے موجود تھے۔ جب عثمانی دور خلافت آیا تو فتوحات کا دائرہ اور بڑھا
اور اس کے ساتھ ساتھ مساجد میں بھی اضافہ ہوا۔ اس دور میں قرآن پاک کے جس قدر
نسخے موجود تھے ان کا شمار انسانی استطاعت سے باہر ہے"۔

(الفصل بین الملل و النحل لابن حزم)

ماخذ دوم ___ سنّت

سوال ۲۶: سنّت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کیجئے اور بتلایئے کہ اس کو دین میں کیا مقام حاصل ہے؟

جواب:

سُنت کا مفہوم

لغت میں سنت طریقہ، راستہ اور راہ عمل کو کہتے ہیں، خواہ وہ راستہ اچھا ہو
یا برا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے
عمل کا بھی اجر ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی جو قیامت تک اس سنت کی راہ پہ گامزن

ہوں گے" دینی اصطلاح میں سنت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا اور اس کے پابند رہے۔

حدیث کا مفہوم

حدیث عربی زبان میں خبر، بات، یا گفتگو کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا

"فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ" وہ اس کے بعد کس چیز پر ایمان لائیں گے

حدیث کے معنی نئی چیز یا نئی بات بھی ہے۔ اس معنی کی رو سے یہ لفظ قدیم کی ضد ہے۔ حادثہ کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے۔ اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل یا تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔ حدیث کی تین قسمیں ہیں۔

۱ : **قولی حدیث** : جس حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان کیا گیا ہو اسے قولی حدیث کہتے ہیں۔

۲ : **فعلی حدیث** : جس حدیث میں آپؐ کے کسی فعل کا ذکر کیا گیا ہو اسے فعلی حدیث کہتے ہیں۔

۳ : **تقریری حدیث** : کوئی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کیا گیا ہو اور آپؐ نے اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ تو اسے تقریری حدیث کہتے ہیں۔

حدیث وسنّت کا فرق : بعض علماء حدیث وسنت کے مابین یہ فرق قرار دیتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے طریق روایت کو حدیث کہتے ہیں بخلاف ازیں سنت آپ کے اس معمول کا نام ہے جس پر آپؐ نے مداومت کی ہو اور عمر بھر اسے متعدد مرتبہ انجام دیا ہو۔ محدثین کے یہاں حدیث وسنت کے الفاظ مترادف ہیں۔ البتہ اگر فرق کے لئے کسی جگہ کوئی قرینہ موجود ہو تو دونوں میں فرق کر سکتے ہیں۔ علماء کے یہ اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱ : سنت کا لفظ آنحضور کے اقوال و افعال اور طریق رسولؐ و صحابہؓ سب کو شامل ہے
(کشف الاسرار علامہ عبدالعزیز حنفی ص۳۵۹)

۲ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور تقریر کو سنت کہتے ہیں (قواعد الاصول صفی الدین حنبلی ص ۱۹)

۳ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کا نام سنّت ہے (منہاج للبیضاوی ص ۱۱)

۴ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر کو سنت کہتے ہیں ۔ علماء کے نزدیک حدیث وسنت کے الفاظ ہم معنی ہیں (توجیہ النظر للجزائری ص ۳)

حُجیّت واہمیت حدیث

قرآن کریم کے بعد حدیث اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے ۔ جو مضامین قرآن کریم میں مجمل بیان ہوئے ہیں حدیث ان کی توضیح وتشریح کرتی ہے ۔ اگرچہ حدیث نبوی کا مرتبہ قرآن پاک کے بعد ہے تاہم حدیث قرآن پاک ہی کی طرح ایک مستقل ماخذ قانون ہے اس لئے کہ حدیث میں ایسے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں جو قرآن پاک میں مذکور نہیں ہیں ۔ البتہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مستقل مصدر شریعت ہونے کے باوجود حدیث قرآن کے تابع ہے ۔

حدیث نبویؐ دین میں حجت اور سند کا درجہ رکھتی ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وعمل جو آپؐ کی جانب منسوب ہو اور اصول روایت ودرایت اور قرآنی معیار سے خلاف نہ ہو تو وہ جمہور امت کے نزدیک واجب العمل ہے ۔ یہ بدیہی بات ہے کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب اس کی اطاعت کرنا ہے ۔ عقل اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ اطاعت کے بغیر بھی ایمان کا کچھ مطلب ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح رسولؐ کو رسولؐ تسلیم کرنے کے بعد اس کی اطاعت کو موجب رضائے خداوندی تصور کرنا ضروری ہے ۔ اس لئے کہ رسولؐ پر ایمان لانا اپنے اندر رسولؐ کی اطاعت کا مطالبہ بھی رکھتا ہے ۔ حدیث نبویؐ کے حجت اور سند ہونے کے دلائل کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔

۱ : قرآنی دلائل۔
۲ : صحابہ کرامؓ اور جمہور علمائے امت کے افکار و نظریات۔
۳ : عقلی براہین و دلائل۔

اب ہم تینوں قسم کے دلائل پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔

حدیث نبویؐ کی حجیت میں قرآنی دلائل۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اطاعت رسولؐ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران۔۱۶۴)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر بڑا احسان کیا کہ انہی میں سے ایک رسولؐ ان میں بھیجا جو اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے۔ ان کے اخلاق کو پاک و صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مذکورہ صدر آیت سے روشن ہوتا ہے کہ رسولؐ کا مشن صرف آیات کا پہنچانا ہی نہیں بلکہ آیات کا سکھلانا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ آیات کے سنا دینے کو تعلیم نہیں کہتے تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ مشکل الفاظ کی تشریح کی جائے اور مجمل مطالب کو کھول کر بیان کیا جائے۔ تعلیم کے کئی طریقے ہیں۔ معلم کبھی زبان سے سکھاتا ہے اور کبھی عمل سے۔ بعض اوقات زبان و عمل دونوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس آیت میں تعلیم کتاب و حکمت سے احادیث و سنن مراد ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے ترجمان و مفسّر بھی تھے۔ بنا بریں قرآن پاک کی وہ تفسیر جو مفسّر کتاب کی تعلیمات کو نظر انداز کر کے اپنی عقل و فکر کے بل بوتے پر بیان کی جائے ضروری نہیں کہ قرآن کو اتارنے

والے کے مقصد کے مطابق ہو۔ آیت میں آپؐ کی بعثت کے چار مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔

۱ : تلاوت کتاب۔

۲ : تعلیم کتاب۔

۳ : تزکیۂ نفوس۔

۴ : تعلیم حکمت۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّا اَنزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء-۱۰۵)

بے شک ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپؐ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپؐ خدا کی رہنمائی میں لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔

اس آیت میں "بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ" کا جملہ قابل غور ہے "اَرَاءَةِ الٰهِي" (اللہ کے دکھانے) میں کتاب و حکمت کی وہ تعلیم شامل ہے جسکا دوسرا نام حدیث و سنت ہے۔ اِرَاءَت (دکھانا) اور تَنْزِيل (اتارنا) معنی و مفہوم کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں تنزیل اس وحی کو کہتے ہیں جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو۔ اِرَاءَت میں الہام و القاء داخل ہے جو بذریعہ الفاظ نہ ہو۔ وحی کا لفظ لغوی اعتبار سے تنزیل اور اراءت دونوں کو شامل ہے۔ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ کو محدثین اسلام مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وَحِي خَفِي" یا "وَحِي غَيْرِ مَتْلُو" کہتے ہیں یعنی اللہ کی وہ اِرَاءَت (دکھانا) جس کا اظہار و بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث و سنت کے ذریعہ سے کیا وحی میں داخل ہے اگرچہ اس کے الفاظ کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اس سے واضح ہوا کہ آنحضورؐ کے اقوال اور آپکے فیصلے ایک بشر کے فیصلے نہیں بلکہ اللہ کی "اِرَاءَت" کا نتیجہ اور فراست نبویہ کا وہ نتیجہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسولؐ کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔

اس آیت سے صراحتاً واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تو "تنزیل" ہوئی اور اس کا مصداق قرآن ہے۔ دوسری چیز آپ کو "اِرَاءَتِ اِلٰہی" (بِمَا اَرَاكَ اللّٰہ) عطا ہوئی جو تنزیل سے ایک الگ چیز ہے۔ لہٰذا اس اِرَاءَتِ اِلٰہی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہیئے اور وہ حدیث و سنت ہے۔ وحی خفی کی شہادت قرآن پاک میں بکثرت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر دو آیتیں درج ہیں۔

"اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" (اَلْقِیَامَة) — اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر اس کی وضاحت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔

(۱) جمع قرآن (۲) قرأت قرآن (۳) بیان قرآن۔

۱ : جمع قرآن : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تالیف کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رسول پاک کو کسی آیت میں یہ حکم نہیں دیا کہ فلاں ترتیب کے مطابق جمع کرو یا فلاں آیت کو فلاں سورت میں رکھو۔ ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی جمع و تالیف کا کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا تھا۔ اس آیت سے واشگاف ہوتا ہے کہ رسول کا وہ کام نجی حیثیت کا نہ تھا بلکہ آپ نے وہ کام رسول ہونے کی حیثیت میں اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی و رہنمائی میں انجام دیا تھا۔

۲ : بیانِ قرآن : اسی طرح بیان قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ بیان کے معنی ہیں تشریح و توضیح اور مجمل احکام کی تفصیل و تبیین ہے۔ "ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمل الفاظ و مطالب کی توضیح اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں ایسی تشریح کہیں مذکور نہیں۔ ایسی تشریحات صرف حدیث ہی میں

میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشریحات آنحضورؐ نے بحکم خداوندی (بذریعہ وحی خفی) انجام دیں لہٰذا یہ بھی وحی میں داخل ہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو رسولؐ کی بجائے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

۳: قرأت قرآن پاک رسولؐ کا فعل ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کی قرأت بحکم خداوندی تھی۔ حدیث کا تفسیر قرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

"وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" (النحل۔ ۴۴)

ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تاکہ لوگوں کے سامنے آپؐ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

نیز فرمایا۔

"وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ" (النحل۔ ۶۴)

ہم نے آپؐ پر قرآن کو اسی لئے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ اس چیز کو واضح کر دیں جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

مذکورہ صدر آیات سے واشگاف ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ قرآن کا ترجمان و مفسر بھی ہو۔ یہ تفسیر نبویؐ حدیث میں مذکور ہے۔ کتب حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات قرآن تفصیلاً مذکور ہیں۔

یہود بنی نضیر کو جب جلاوطن کیا گیا تو ان کے کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دیئے گئے اور کچھ چھوڑ دیئے گئے۔ اس ضمن میں ارشاد فرمایا۔

"قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰی اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" (الحشر۔ ۵)

کھجوروں کے جو درخت آپؐ نے کاٹ دیئے یا اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا وہ خدا کی اجازت سے تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کھجور کے درختوں کو کاٹنے کا حکم دیا تھا وہ بحکم خداوندی تھا۔ مگر قرآن کی کسی آیت میں اس اذنِ خداوندی کا ذکر نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم بذریعہ تنزیل نہ تھا بلکہ وحی خفی کے ذریعے تھا۔

مذکورہ ذیل آیت میں صحابہ کرامؓ کو اہل کتاب کی شرارتوں سے ہوشیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ (آل عمران — ۱۰۱)

اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیئے حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسولؐ موجود ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ کفر سے محفوظ رکھنے والی دو چیزیں ہیں (۱) اللہ کی آیات (۲) رسولؐ کا وجود۔ موجودہ زمانہ میں جب قرآن تو موجود ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا دوسرا سرچشمہ حدیث و سنت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ پس جب قرآنی دلائل سے حدیث کا مقام و مرتبہ متعین ہو گیا تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ حدیثِ نبویؐ صرف تاریخی اہمیت ہی کی حامل نہیں بلکہ دین میں حجّت اور سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اس امر کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ حدیث دین میں سند کا مرتبہ رکھتی ہے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آیا حدیث واجب التعمیل بھی ہے یا نہیں؟ تاہم چند قرآنی آیات سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کے مقدس افعال و احکام کی روشنی میں امت اپنی منزل تک پہنچ سکے اور اپنے دامن کو فلاح و نجات کے گوہر مقصود سے مالا مال کر سکے

قرآن میں فرمایا

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ — ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

(النساء - ۶۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا مطاع ہونا ضروری ہے۔ اور کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب الاطاعت تسلیم کرنا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ جس طرح ہر آسمانی کتاب واجب الاطاعت ہوتی ہے اسی طرح ہر رسول کی اطاعت بھی ایک لازمی چیز ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انبیاء تو کتابوں کے بغیر بھی ہیں مگر کوئی کتاب نبی کے بغیر نہیں اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی بلا کتاب بھی بالاستقلال واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اطاعت خداوندی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

"أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ" — اللہ کی اطاعت کیجئے اور رسول کی اطاعت بجا لائیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اطاعت خداوندی کا جو مرتبہ ہے وہی اطاعت رسول کا بھی درجہ ہے۔ آنحضور کی زندگی میں تو آپ کی اطاعت کی صورت واضح ہے۔ آپ کی وفات کے بعد اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے اقوال و ارشادات اور آپ کے بیان کردہ اوامر و نواہی کو واجب الاطاعت قرار دیا جائے اور ان کو عملی صورت میں اپنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا مجموعہ حدیث نبوی کی صورت میں ہمارے پاس بتمام و کمال محفوظ ہے۔ حدیث نبوی کا تحفظ در حقیقت جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم خصوصیت ہے جو آپ کو دیگر انبیاء

درسل میں ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے وہاں یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اہل
اسلام نے اپنے پیغمبرؐ کے اقوال وافعال اور سیر وسوانح کے حفظ وضبط میں کس قدر
محنتِ شاقہ برداشت کی ہے۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی ومصلح کے احوال
واقوال اس احتیاط کے ساتھ جمع نہیں کئے قرآن پاک میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا
أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ
مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب-۳۶)

اور کسی مومن مرد وعورت کو زیب
نہیں دیتا کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ
کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے
معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسولؐ کا اطلاق کیا
کیا جاتا رہے گا اس وقت تک آپؐ کا ہر فیصلہ واجب التسلیم ہو گا ظاہر ہے کہ
آپؐ کے فیصلہ جات ہی کا نام حدیث وسنت ہے۔

قرآن پاک میں رسول پاک کی صرف اطاعت کا ہی حکم نہیں دیا گیا بلکہ آپؐ کی
اتباع کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
(الاحزاب-۲۱)

مسلمانو! تمہارے لئے رسولؐ کی ذات
میں بہترین نمونہ ہے۔

قرآن میں فرمایا

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ
لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
(آل عمران — ۳۱)

آپؐ فرما دیں کہ اگر خدا سے محبت کرتے
ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت
کرے گا اور تمہارے گناہ بخش
دے گا۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اتباع نبویؐ حب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مطلب یہی ہے کہ آپ کے اقوال و اعمال اور سیرت مبارکہ کی پیروی کی جائے اسی کو حدیث کہتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منکر حدیث حب خداوندی کے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ علاوہ ازیں آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث نبوی کی پیروی باعث مغفرت ہے

فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ (الاعراف ۔ ۱۵۸)	اللہ اور اس کے رسولؐ نبی امی پر ایمان لاؤ جو خدا اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دے کر اتباع رسولؐ کا حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد خود بخود اطاعت الٰہی لازم ٹھہرتی ہے اور اطاعت الٰہی کی واحد صورت یہ ہے کہ رسولؐ کی پیروی کی جائے۔ اس لئے کہ خدا کے احکام ہمیں رسولؐ کے ذریعہ سے ملتے ہیں۔ لہذا اطاعت رسولؐ کے بغیر اطاعت خداوندی ممکن ہی نہیں۔

قرآن پاک نے جس طرح خدا کی نافرمانی کو ضلالت قرار دیا اور اس کے مرتکب کو وعید کا مستحق قرار دیا ہے اسی طرح رسولؐ کی نافرمانی کو بھی ضلالت ٹھہرایا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (الاحزاب ۔ ۳۶)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔
وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (الجن ۔ ۲۳)	اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ (النساء ـــ ۴۲)

جو لوگ رسولؐ سے سرکشی کرتے ہوئے اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

قرآن کریم میں اطاعت رسولؐ کی اسقدر تاکید کی گئی اور اس ضمن میں اس کثرت سے آیات وارد ہوئی ہیں کہ ان کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ مذکورہ صدر آیات مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق ہیں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

سوال ۶۷: حدیث کے بارے میں صحابہ کرامؓ اور دیگر اکابر کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ نیز عقلی دلائل و براہین سے حدیث کی اہمیت واضح کیجئے۔

جواب: حجیت حدیث پر علمائے امت کا اجماع

حدیث کی حجیت و اہمیت کے بارے میں دوسری قسم کے دلائل تاریخی ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ عہد رسالتؐ سے لے کر دور حاضر تک مسلمانان عالم حدیث نبویؐ کو دین میں حجت اور سند تصور کرتے آئے ہیں۔ اس امت میں صحابہ کرامؓ کی جماعت مسلمانوں کی نگاہ میں بے حد اکرام و احترام کی حامل ہے اسی جماعت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "خیر القرون" کے الفاظ سے تعبیر کیا اور قرآن نے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ کا مدحیہ سرٹیفکٹ عطا کیا۔ ایسی پاکیزہ جماعت میں یہ مسئلہ کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا کہ آیا حدیث نبویؐ واجب التعمیل ہے یا نہیں؟

صحابہؓ کی اتباع رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ آنحضورؐ نے خطبۂ جمعہ کے دوران لوگوں سے کہا
"اَیُّهَا النَّاسُ اِجْلِسُوْا" (اے لوگو بیٹھ جاؤ) حضرت عبداللہؓ بن مسعود رضی اللہ عنہ
ذرا دیر سے جمعہ پڑھنے آئے۔ ابھی مسجد میں اسی جگہ پہنچے تھے جہاں جوتے
اتارے جاتے ہیں کہ آپؐ کے یہ الفاظ سنے اسی جگہ بیٹھ گئے اور آگے جانے کی ہمت
نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ آنحضورؐ کو کہنا پڑا "تَعَالَ یَا ابْنَ مَسْعُوْدٍ" (ابن مسعود آگے
آجائیے) یہ صحابہؓ کے جذبۂ اطاعت رسولؐ کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ تابعین اور تبع
تابعین کے دور میں بھی انکار حدیث کا یہ فتنہ پیدا نہ ہوا۔ عہد رسالتؐ سے لے
کر دور حاضر تک ہزاروں محدثین مجددین۔ علماء۔ فقہا۔ صلحاء تمام حدیث نبویؐ
کو دین میں سند کی حیثیت دیتے چلے آئے ہیں۔ اصول فقہ کے علماء قرآن کریم کے
کے بعد حدیث نبویؐ کو اسلامی قانون کا دوسرا مصدر و ماخذ تسلیم کرتے آئے ہیں

حدیث کے بارے میں آئمہ اربعہ کی آراء

آئمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ حدیث نبویؐ کے حد درجہ قدر دان تھے اور اس کو
قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا سرچشمہ تسلیم کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ: امام بیہقی المدخل میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے
نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا "اِذَا جَاءَ عَنِ
النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَی الرَّاسِ وَالْعَیْنِ" (جو بات آنحضورؐ سے منقول
ہو وہ بسر و چشم تسلیم ہے)

روضۃ العلماء میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

اُتْرُکُوْا قَوْلِیْ بِخَبَرِ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ الصَّحَابَةِ	میرے قول کو حدیث نبویؐ اور صحابہؓ کے قول کی موجودگی میں ترک کر دو۔

امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے

اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَھُوَ مَذْھَبِیْ جب صحیح حدیث موجود ہو تو میرا

مذہب وہی ہے۔

(اقوالِ ثلاثہ کے لئے دیکھئے تفسیر مظہری جلد ثانی صفحہ ۱۵۴)

خلیفہ منصور عباسیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو لکھا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ قیاس کو حدیث کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں"۔ امام صاحبؒ نے جواب میں لکھا "امیرالمومنین! بات یوں نہیں جیسے آپ کو پہنچی۔ میں تو پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں اور پھر حدیث رسولؐ پر، پھر خلفائے اربعہؓ کے فیصلہ جات پر، پھر دیگر صحابہؓ کے فتاویٰ پر۔ جب صحابہؓ میں اختلاف موجود ہو تو میں قیاس کرتا ہوں۔

(المیزان للشعرانی جلد ۱ صفحہ ۶۲ طبع مصر)

امام مالکؒ : مسجد نبویؐ کے محدث اور خطیب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روضۂ نبویؐ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے

"ہر شخص کی بات تسلیم کی جاسکتی ہے (اگر صحیح ہو) اور اسے رد بھی کیا جاسکتا ہے (جبکہ درست نہ ہو) مگر اس قبر والےؐ کی ہر بات واجب التسلیم ہوتی ہے

(حیات امام مالکؒ ابوزہرہ)

امام شافعیؒ : رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں چلا جس نے حدیث وسنت کا انکار کیا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ : امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث نبویؐ سے والہانہ محبت تھی۔ مسند احمد بڑی محنت سے تالیف کی اور اس میں چالیس ہزار احادیث درج کیں۔ کسی معاملہ میں جب ان کو حدیث مل جاتی تو اس پر فوراً عمل کرتے۔ صحابہؓ کے اجماع کو حجت قرار دیتے تھے۔ آپ قیاس کے مقابلہ میں مرسل یا ضعیف حدیث

کو بھی ترجیح دیتے تھے۔ قیاس پر اسوقت عمل کرتے جب کتاب و سنت یا اقوال صحابہؓ میں سے کوئی دلیل بھی موجود نہ ہوتی۔ (اعلام الموقعین)

قرآن کریم میں فرمایا

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا

جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسولؐ کی مخالفت کرے اور اہل ایمان کی راہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے تو ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔

چونکہ آجتک تمام اکابر علماء حدیث و سنت کو حجت اور سند مانتے آئے ہیں اس لئے حدیث کو واجب التعمیل قرار دینا بھی ایک "سبیل المومنین" قرار پاتا ہے۔ لہذا حدیث کے دین میں حجت ہونے سے انکار کرنا "مومنین کی راہ" سے گویا روگردانی کرنا ہے۔ لہذا ایسا شخص خدا و رسولؐ کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے اور اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کرتا ہے۔

حجیت حدیث کے عقلی دلائل

حدیث کے حق میں تیسری قسم کے دلائل وہ ہیں جو عقل انسانی سے تعلق رکھتے ہیں عقل انسانی سے بلاشبہ حدیث نبویؐ کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند امور غور طلب ہیں۔

ا : عقل انسانی سب سے پہلے اس بات پر غور کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کو رسل و انبیاء کے ذریعہ کس لئے بھیجا؟ اس میں کیا مصلحت مضمر تھی؟ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ترین بات یہ تھی کہ آسمانی کتابوں کو مطبوعہ حالت میں زمین

پرہ یہ صحیح کہ ہر فردِ بشر کے پاس کتاب کا ایک نسخہ پہنچا دیتا۔ یہ اشاعتِ کتب کا موزوں ترین طریقہ تھا۔

قرآن کریم اس عقلی سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام کو بندوں تک پہنچائیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ انبیاء خداوندی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ ان کو دیکھ کر اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالیں۔ قرآن میں فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النسآء ۔ ۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنے عمل کے ساتھ آیات الٰہی کی تفسیر کرتا ہے اور اس کی عملی زندگی احکام الٰہی کا زندہ پیکر ہوتی ہے۔

۲: اگر آسمان سے صرف کتاب بھیج دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ کتاب کے فہم و ادراک میں ٹھوکریں کھاتے اور اس کی من مانی تفسیر کرتے۔ ہر شخص اپنی تفسیر کو صحیح قرار دیتا اور ان کے درمیان کوئی ایسی مرکزی شخصیت نہ ہوتی جس کی طرف اختلافی امور میں رجوع کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض کتاب کافی نہیں بلکہ کتاب کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے۔ نیز یہ کہ جسطرح کتاب کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسولؐ کا اتباع فرض عین ہے۔

۳: جو شخص آسمانی کتاب کو کافی سمجھتا اور اسوۂ رسولؐ کو غیر ضروری قرار دیتا ہے وہ دراصل اس واسطے اور ذریعے کو کاٹنا چاہتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے وہ گویا یوں کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لئے کافی تھی خدا نے یونہی

بلا ضرورت رسولؐ بھیجنے کا تکلف کیا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

۴: کتاب خداوندی اور رسولؐ کا باہمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسوۂ رسولؐ کی پیروی ان کی حیات جسمانی تک تھی؟ اگر یہ صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ آنحضورؐ کی رسالت صرف اسی عہد تک محدود تھی جب آپ بقید حیات تھے اور آپؐ کے رحلت فرماتے ہی آپؐ کی رسالتؐ کا تعلق عملاً دنیا سے ٹوٹ گیا۔ اس صورت میں رسالتؐ کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگر رسولؐ کا کام ایک پوسٹ مین کی طرح صرف کتاب کا پہنچا دینا تھا اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو اس صورت میں رسولؐ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ کام تو کوئی فرشتہ بھی کر سکتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ لوگوں تک براہ راست بھی کتاب پہنچا سکتا ہے۔

۵: اگر بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے قرآن کریم کے علاوہ سیرت نبویؐ کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر ۲۳ یا ۲۴ برس کی قلیل مدت کے لئے رسالتؐ کا اتنا بڑا منصب قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خصوصاً جب کہ رسالت کا یہ عظیم سلسلہ آنحضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ختم ہونے والا تھا۔ ایسے غیر ضروری اور ناپائیدار سلسلہ کو اس قدر شد و مد کے ساتھ جاری کرنا علیم و خبیر خداوند تعالیٰ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

۶: اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی اور دائمی ہے تو وہ احکام بھی دائمی ہیں جن میں آپؐ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آپؐ کو اسوۂ حسنہ فرمایا گیا ہے۔ آپؐ کی پیروی کو رضائے خداوندی کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا اور ہدایت کا دامن آپؐ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ رضائے الٰہی اور ہدایت کے حصول کی ضرورت جس طرح عہد رسالتؐ کے

لوگوں کو تھی اسی طرح دور حاضر کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک یہ ضرورت باقی رہے گی۔ اس سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اطاعتِ رسولؐ اب بھی ضروری ہے۔

۷۔ اگر حدیث و سنت کو دین میں کوئی مقام حاصل نہیں اور رسولؐ کی بات کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں تو پھر رسولؐ کی یہ بات بھی ناقابل اعتماد رہے کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے۔ اگر قرآن کے بارے میں نبیؐ کا یہ قول حجت ہے تو اس کے دیگر اقوال بھی یقیناً حجت ہوں گے۔ ورنہ اس کے سب اقوال کو ناقابل تسلیم تصور کرنا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کے بارے میں رسولؐ کی بات صحیح ہو اور باقی سب باتیں ناقابل یقین ہوں۔

مندرجہ صدر عقلی دلائل سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ رسول کی سنت جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آپ نے فرمایا تھا۔

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم ان کو تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ[1] اور میری سنت[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کوئی بات پیش کی جائے تو وہ واجب التعمیل ہے اس کو ترک کرنا جائز نہیں۔ اگر نبیؐ کی سنت میں سے کوئی چیز پیش کی جائے تو وہ بھی اسی طرح واجب العمل ہے۔

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا

"جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے پر جمے رہو اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔"

پس یہ حقیقت کسی شبہ سے بالا ہے کہ اسوۂ رسولؐ اور حدیث و سنت ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس کی پیروی تاقیامت ہر فرد بشر کے لئے لازم ہے۔

حدیث کی کتابت اور جمع و تدوین

سوال نمبر ۶۵: عام تاریخ نویسی اور کتابت حدیث کے مابین کیا فرق ہے؟ دونوں کا تقابل کر کے بتایئے کہ ان میں کونسا طریقہ زیادہ قابل اعتماد ہے اور کیوں؟

جواب: حدیث نبویؐ کی جمع و تدوین اور عام تاریخی واقعات میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

تاریخ نویسی اور کتابت حدیث

۱: تاریخی واقعات کا تعلق کسی حکومت، کسی بڑی جنگ، کسی قوم کے کوائف و احوال وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے بخلاف ازیں حدیث کا تعلق مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ ہے۔ ایک شخص کے احوال یاد رکھنا ۔۔۔ خصوصاً جب کہ اس کی شخصیت آنحضورؐ کی طرح مکرم و معظم ہو ۔۔۔ اس کی نسبت کہیں آسان تر ہے کہ مختلف لوگوں کے حالات یاد رکھے جائیں اور ان کو روایت کیا جائے۔ یہ یادداشت اور بھی آسان ہو جاتی ہے جب کہ واقعات کو بیان کرنے والے صحابہ کرامؓ جیسے لوگ ہوں جو آنحضورؐ کی ذات گرامی کے ساتھ والہانہ شغف رکھتے تھے اور ایک لمحہ بھی آپؐ سے جدا نہیں

ہونا چاہتے تھے۔

۲: یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مومنین یعنی صحابہؓ کرام کا باہمی تعلق ایک چشم دید گواہ کا تھا جس کی بنیادیں عشق و سرمستی۔ والہانہ محبت اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف آپؐ کی ذات میں گم ہونے کا آخری اور حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا۔ نبیؐ اور صحابہؓ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں ہر جگہ ملتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے آپؐ کی زندگی کے ہر ہر واقعہ اور ہر ہر جز کو پوری طرح محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ کے میدان میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک پہنچا دیا۔ تم میں سے جو حاضر ہو وہ غائب کو پہنچا دے ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہو کیونکہ تم مجھ سے سن رہے ہو۔ تم سے بھی سنا جائے گا۔ جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے"۔ (صحاح ستہ)

۳: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جن دینی حقائق کی اشاعت کا ذمہ دار بنایا تھا وہ اس کے چھپانے کو شرعی جرم خیال کرتے تھے اس لئے کہ صحابہؓ کو آنحضورؐ کی یہ حدیث یاد تھی۔ آپؐ نے فرمایا

"جس سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی"۔

آنحضورؐ کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ بعض صحابہؓ سے ایسی روایات نقل کی گئی ہیں

جو انہوں نے عالم نزع میں اس خوف کی وجہ سے بیان کر دیں کہ ان پر علم کو چھپانے کا الزام نہ آجائے۔

۴: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ "جو شخص مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا"۔ عقل انسانی یہ باور کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ صحابہ جس درجہ کے مخلص مومن تھے ایسا شخص آنحضورؐ پر دانستہ جھوٹ باندھنے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ صحابہ ایسے سیرت و کردار کے آدمی سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً جب کہ قرآن نے بھی خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے کثیر الروایت صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احتیاط روایت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی حدیث بیان کرنے لگتے تو کہتے "صادق و مصدوق ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے"۔

اس کے بعد جو حدیث بیان کرنا چاہتے بیان کرتے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ صحابہ آپؐ کا یہ ارشاد سن کر بھی آپؐ پر جھوٹ باندھنے کی جسارت کرتے۔

۵: اصحابِ رسولؐ کو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آنحضورؐ کی زندگی کا محافظ و مبلغ قرار دیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ جیسے مورخین کو اپنی تاریخ سے کس حد تک وابستگی تھی اور انہوں نے اس تاریخ کی کتابت و حفاظت میں کس حد تک جانفشانی و عرق ریزی سے کام لیا ہوگا جن کے نزدیک آنحضورؐ کا ایک ایک بال دنیا و مافیہا سے عزیز تر تھا ان کے نزدیک آپؐ کے ملفوظات گرامی کس قدر بیش قیمت ہوں گے۔

۶: حدیث نبوی کے مذکورہ صدر قابل اعتماد ماخذ و مصادر کے مقابلہ میں

تاریخی واقعات نہایت غیر اہم اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی کل کائنات قبروں کے کتبے، چند پرانے سکے، کھنڈرات اور خود نوشت سوانح ہیں جن کی کوئی سند سرے سے موجود ہی نہیں۔ عین ممکن ہے کہ قبر پر تختی کسی نے بعد میں لگا دی ہو۔ یہ واقعات ایک شخصی روایت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں۔

۷۔ تاریخی واقعات کے عین برعکس مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ جسے حدیث کہتے ہیں ایک امتیازی شان کا حامل ہے اس تاریخی سرمایہ کے محافظ و مورخ ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہیں جن میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہیں۔ یہ تمام مورخ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عینی شاہد ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ آنحضورؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ان گواہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ یہاں ایسی کسی تقسیم کا امکان نہ تھا کہ زندگی کا کچھ حصہ پبلک کے سامنے ہو اور باقی زندگی پر تاریکی کے پردے پڑے رہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی خانگی زندگی کی تفصیلات تک منظر عام پر آگئیں۔ اس لئے کہ آپؐ کی پوری زندگی مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

سوال ۷۹: حدیث کی جمع و تدوین پر ایک مختصر مقالہ لکھیے۔

جواب: کتابت حدیث کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس کا آغاز ہجرت کے دو ڈھائی سو سال بعد اس وقت ہوا جب صحاح ستہ کے مولفین پیدا ہوئے اور انہوں نے حدیث کی یہ چھ مشہور کتب تالیف کیں۔ یا اس سے ذرا آگے بڑھ کر یہ کہہ دیا کہ بنو امیہ کے عہد خلافت میں ابن شہاب زہری نے کتابتِ حدیث کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات جتنی مشہور ہے اسی قدر بے بنیاد بھی ہے۔

کتابت حدیث عہد رسالتؐ میں

یہ حقیقت ہے کہ کتابت حدیث کی داغ بیل عہد رسالتؐ میں پڑ گئی تھی۔ صحابہؓ حدیث کی زندہ کتاب تھے اور کتابت حدیث کا آغاز بھی انہی سے ہوا۔ یہ درست ہے کہ حدیث کی باقاعدہ تدوین آگے چل کر ہوئی۔ مگر صحابہؓ نے اس ضمن میں جو خدمت انجام دی تھی اگر اس پر اکتفا کیا جاتا تو حدیث کا وہ ذخیرہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ ذیل میں کتابتِ حدیث سے متعلق صحابہ کے چند واقعات مذکور ہیں:۔

۱ : جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک "تحریری دستور مملکت" لکھوا کر ریاستِ مدینہ میں نافذ کیا۔ یہ کتابتِ حدیث کا پہلا ثبوت ہے۔ اس تحریر میں آپؐ نے مہاجرین انصار مدینہ اور یہود کے حقوق و فرائض متعین فرمائے۔

۲ : مدینہ تشریف لاتے ہی آپؐ نے مردم شماری کرائی اور فرمایا "مجھے ان لوگوں کے نام لکھوا دو جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں"۔

۳ : سرکاری دستاویزات اور معاہدوں کا سلسلہ ہجرت سے پہلے ہو جاری ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے تمیم داری کو فلسطین کا شہر "حبرون" جاگیر میں دیا تھا۔ نیز سراقؓ بن مالک کو پروانۂ امن عطا کیا۔

۴ : سنہ ۱ھ میں قبیلہ جہینہ کو حلیف بنا کر ان سے تحریری معاہدہ کیا۔ اسی طرح بنی ضمرہ سے جو تحریری معاہدہ کیا تھا اسکا مسودہ اب تک موجود ہے۔

۵ : سنہ ۵ھ میں آپ نے بنو فزارہ اور غطفان سے معاہدہ کر کے ایک دستاویز لکھوائی جسے بعد میں ضائع کر دیا گیا۔

۶ : سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کا مشہور صلح نامہ تحریر کیا گیا جس کے الفاظ پر کافی ردّ و قدح ہوئی۔

۷۔ ۹ھ میں آل اکید ردومۃ الجندل سے تحریری معاہدہ کیا اور قیصر و کسریٰ مقوقس اور نجاشی وغیرہ شاہان عالم کو تبلیغی خطوط لکھے

۸۔ انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر آپ نے مختلف حکام کو جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں جو ہدایت نامے بھیجے وہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔

غرض یہ کہ اس قسم کی سیاسی دستاویزیں تحریر کرنے کا کام عہد رسالت میں شروع ہو گیا تھا۔

کتابت حدیث میں صحابہؓ کا کردار

مندرجہ بالا بیان اس امر کی آئینہ داری کرتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کی نشر و اشاعت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ تاہم آغاز اسلام میں آپؐ نے احادیث لکھنے سے اس لئے روک دیا تھا کہ قرآن و غیر قرآن دونوں مخلوط نہ ہو جائیں صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"قرآن کے سوا مجھ سے کچھ نہ لکھا کرو جس نے کچھ لکھا ہے وہ مٹا دے"۔

(صحیح مسلم)

جب صحابہ میں قرآن اور غیر قرآن کا شعور پیدا ہو گیا تو آپؐ نے کتابتِ حدیث کی اجازت مرحمت فرمادی۔ بعض محدثین مثلاً امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت کو موقوف یعنی انہی کا قول قرار دیا ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث مرفوع نہ ہو گی۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی بحوالہ فتح الباری)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتابتِ حدیث کی اجازت ملنے پر صحابہؓ کرام نے عہد رسالت میں کتابت حدیث کا بیڑا اٹھایا تاہم وہ زیادہ تر حافظہ پر اعتماد کرتے رہے۔ عربوں کی قوت حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور رہی ہے۔ اور صحابہؓ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عہد رسالتؐ کے واقعات سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس دور میں کتابت حدیث کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ عہد صحابہ رضی اللہ عنہ میں حدیث نویسی کے چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے سوا کسی صحابی کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد نہ تھیں اس کی وجہ تھی کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ سے جو کچھ سنتے وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا (بخاری شریف جلد اول)

بعض لوگوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خوش ہوتے ہیں کبھی ناخوش اور تم سب لکھتے چلے جاتے ہو۔ چنانچہ آپ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو فرمایا تم لکھ لیا کرو اس زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔

(ابوداؤد جلد دوم صفحہ)

۲: بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے فتح مکہ والے سال بنو لیث کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ کی حرمت و عزت کے بارے میں خطبہ دیا۔ ایک یمنی شخص (ابوشاہ) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یہ باتیں مجھے لکھوا دیجئے۔ چنانچہ اس کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

۳: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کے احکام و مسائل لکھوا کر زکوٰۃ فراہم کرنے والے عمال کو بھیجتے تھے۔ یہ احکام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے پاس تحریری شکل میں موجود تھے۔

(دارقطنی کتاب الزکوٰۃ صفحہ ۲۰۹)

۴: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس متعدد احادیث لکھی ہوئی موجود تھیں۔ جن کو آپ اپنی تلوار کے غلاف میں رکھتے تھے۔ ایک بار لوگوں کی درخواست پر آپ نے دکھایا تھا۔ (بخاری شریف)

۵: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کی شرائط لکھوائیں جو سہیل بن عمرو کو دی گئیں اور ایک

تھا اپنے پاس رکھی تھی۔ (طبقات ابن سعد ص۸۵)

۶: عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو صدقات، دیات اور فرائض سے متعلق احکام لکھوا کر ان کو دیئے۔ (کنز العمال جلد ۳ ص۱۸۶)

۷: عبداللہ بن الحکم رضی اللہ عنہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط تھا جس میں مردہ جانوروں سے متعلق احکام تحریر تھے۔ (معجم صغیر)

۸: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر تھی جس میں ترکاری اور زکوٰۃ سے متعلق شرعی احکام درج تھے۔ (دار قطنی ص۲۰۱)

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حدیث کا بڑا سرمایہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس میں اور اضافہ کیا۔ جب تابعین کا دور آیا تو انہوں نے اس کام کو اور وسعت دی۔ آخر صحاح ستہ کے مؤلفین نے کتابت حدیث کے نامکمل کام کی تکمیل کر دی۔ حفاظت حدیث کا آج یہ عالم ہے کہ قرآن کریم کے بعد ذخیرۂ علم میں جو چیز سب سے زیادہ قابل اعتماد اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہے۔

ماخذ سوم — اجتہاد

سوال ۱۳: اجتہاد سے کیا مراد ہے اور اسلامی شریعت میں اس کو کیا مقام حاصل ہے؟

جواب: بعض فقہاء نے کتاب و سنت کے بعد اجتہاد کو اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ قرار دیا ہے۔ اصول فقہ کے اکثر علماء کے نزدیک کتاب و سنت

کے بعد اجماعِ امت قانون کا تیسرا اور قیاس یا اجتہاد چوتھا ماخذ ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مصادر چار ہوں گے۔

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کے لغوی معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے ہیں۔ اصطلاحاً مجتہد اس کوشش کو کہتے ہیں جو شرعی دلائل سے احکام حاصل کرنے کیلئے کی جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس مسئلہ کے بارے میں کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو اور اس پر علماء کا اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو اگر فقیہ کسی دوسرا مسئلہ تلاش کرے جو قرآن و سنت کی بنا پر مدلل ہو، ایک حکم لگانے کو اجتہاد یا قیاس کہتے ہیں چونکہ شرعی احکام کسی نہ کسی غرض و مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں اور یہی مصلحت ان میں علت و حرمت کا فیصلہ صادر کرنے کے لئے معیار و مدار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے فقہاء کسی مسئلہ کی علت معلوم کر کے جب کسی دوسرے مسئلہ میں بھی علت دیکھتے ہیں تو اشتراک علت کی بنا پر دونوں کو ایک حکم میں شریک کر دیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے والد پر حج فرض ہے اور وہ بوڑھا ہونے کی بنا پر سواری کے قابل نہیں۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتا ہوں؟ آپ نے دریافت کیا کیا تم اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہو۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا اگر تمہارے والد پر قرض ہوتا اور تم ادا کر دیتے تو کیا یہ کافی تصور کیا جاتا یا نہیں۔ اس نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا تو اپنے والد کی طرف سے حج ادا کرو (اعلام الموقعین جلد اول ص ۲۳۹)

علامہ آمدی اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی تعریف

اس طرح کرتے ہیں۔

علمائے اصول کے نزدیک اجتہاد اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے کہ یہ مسئلہ شریعت کے موافق ہے۔ (الاحکام جلد ۴ صفحہ ۲۱۸)

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الموافقات" میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں "شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لئے انتہائی کوشش کا نام اجتہاد ہے" (الموافقات جلد ۴ صفحہ ۸۹)

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اجتہاد کی صورت میں کسی مسئلہ کا حکم براہ راست کتاب و سنت سے اخذ نہیں کیا جاتا بلکہ کتاب و سنت کے اشارے ایک حکم معلوم کرنے کی کوشش (اجتہاد) کی جاتی ہے اس لئے اس کو کتاب و سنت کی جانب منسوب کرنے کی بجائے اجتہاد کہا جاتا ہے۔

اجتہاد کی شرائط

چونکہ اصطلاحاً اجتہاد اس کوشش کا نام ہے جو کتاب و سنت کے اشارات سے کوئی حکم نکالنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اجتہاد کے لئے مخلصانہ جہد و سعی سے کام لینے کی ضرورت ہے ناتمام سعی اس لئے بے کار ہے۔ جب تک طلب و تحقیق کے سب ذرائع استعمال نہ کئے جائیں اجتہاد کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اجتہاد کے لئے انتہائی جہد و سعی کا ضروری ہونا مشہور حدیث معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت کیا کہ پیش آمدہ مسائل میں فیصلہ کیوں کر صادر

کروگے؟ انہوں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے حکم معلوم کرنے کی کوشش کرونگا
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ملے تو پھر؟ حضرت معاذ
رضی اللہ عنہ نے عرض کی پھر آپ کی سنت میں اسکا حل تلاش کروں گا۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کروگے؟ حضرت
معاذ رضی اللہ تعالیٰ نے عرض کیا "ثُمَّ اَجْتَهِدُ رَاْيِىْ" پھر میں اپنی صحیح رائے نکالنے
کی کوشش کروں گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی تصدیق فرمائی
اور اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس حدیث میں اجتہاد کو کتاب و سنت کے بعد احکام کے نکالنے میں تیسرا
درجہ دیا گیا ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ قاضی شریح رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں
فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک خط میں انہیں لکھا تھا۔
"جب کوئی واقعہ پیش آئے تو کتاب اللہ کی روشنی میں اسکا فیصلہ صادر کیجئے اگر
ایسا حادثہ رونما ہو جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہ ہو تو
لوگوں کے اجماع کے مطابق فیصلہ کیجئے یا اگر ایسی صورت حال پیش آئے جو کتاب و سنت
میں مذکور نہ ہو اور اس پر اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو تو اندریں صورت، اگر چاہیں
اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کریں اور اگر چاہیں اسے ملتوی کر دیں التوا میرے
خیال میں بہتر ہی ہو گا۔"
(الملل والنحل شہرستانی جلد ۱ صفحہ ۱۵۷)
مذکورہ خط میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مخاطب، قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ
تھے جو عظیم قاضی اور مفتی تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو اجتہاد
کی اجازت دی تھی۔ مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے
کہ اجتہاد کے لئے اہلیت کاملہ شرط ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ارشاد
"اَجْتَهِدُ بِرَاْيِىْ" اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اجتہاد میں سہل انگاری اور

تغافل شعاری کی اجازت نہیں۔

اجتہاد کوئی کھیل نہیں کہ ہر کندہ ناتراش اس میں حصہ لینے لگے۔ اس کیلئے کتاب و سنت کا گہرا علم اور ان حالات سے پوری پوری واقفیت ضروری ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم مطلوب ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص علم دین میں ماہرانہ بصیرت نہ رکھتا ہو وہ قانون کی معمولی چیزیں بھی سمجھنے پر قادر نہیں اجتہاد تو ایک مشکل کام ہے۔ اجتہاد کا صرف یہی مطلب نہیں کہ قانون کی موٹی موٹی دفعات سمجھ لی جائیں بلکہ کتاب و سنت کے اشارات و معتزات شریعت کے لوازمات و مقتضیات کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حکم متعین کیا جائے۔ اس کام کے لئے اتفاقی قابلیت بلکہ ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔

شرعی علوم میں بصیرت تامہ حاصل کئے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات درست ہے کہ اسلام میں اجتہاد کسی مخصوص شخص کی میراث نہیں مگر یہ غلط ہے کہ ہر جاہل اور علوم اسلامیہ و عربیہ سے نابلد شخص اجتہاد کی مسند پر فائز ہو سکتا ہے۔ جس کام کے لئے صلاحیت و استعداد شرط اولین ہو اس کا مجاز ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے۔ اس قابلیت کے ساتھ ساتھ اجتہاد میں غور و فکر ذمہ داری کا بھی سوال ہے۔ جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ صرف لوگوں کے دنیوی معاملات ہی میں دخل نہیں دیتا بلکہ ان کے دین اور ان کی آخرت کے معاملے میں بھی ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ بنا بریں نااہل ہونے کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرنے بیٹھتا ہے تو صرف اپنی ہی آخرت برباد نہیں کرتا بلکہ دوسرے بہت سے لوگوں کی آخرت بھی خطرے میں ڈالتا ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اجتہاد کی تین شرطیں بیان کی گئی ہیں ؎

۱: اجتہاد وہ شخص کر سکتا ہے جو کتاب و سنت میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو
۲: وہ شخص حالات و معاملات پر گہری نگاہ رکھنے والا اور ان کے متعلقات
و لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہو۔
۳: وہ اعلیٰ سیرت و کردار کا آدمی ہو تاکہ لوگ دینی معاملات میں اس پر
اعتماد کر سکیں۔

اجتہاد کی ضرورت

جس طرح مادی زندگی کے لئے مادی وسائل و ذرائع مثلاً ہوا پانی اور
غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی و ایمانی زندگی کے قیام و بقا
کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں تازہ بتازہ ا
نو بہ نو مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نو پید مسائل عہد ماضی میں نہ تھے یہی وجہ
ہے کہ کتاب و سنت میں ان کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ ایک کامل نظام زندگی
ہونے کی حیثیت سے اسلام نے ہر قسم کے پیش آنے والے حالات میں
غیر معلوم احکام کو شریعت کی روشنی میں طے کرنے کا انتظام کیا ہے اور ہر
زمانے کے ماہرین شریعت کا فریضہ ٹھہرایا ہے اجتہاد کر کے دین کو نئے
حالات پر منطبق کریں اور جدید مسائل کا حل تلاش کریں۔ اگر ان مسائل کو شریعت
کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا ربط شریعت
سے ٹوٹ جائے گا۔ حالانکہ کوئی مسلمان یہ نہیں چاہتا کہ اس کی عملی زندگی کا
تعلق اسلام سے ٹوٹ جائے۔

ہم جن جدید مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اگر ان کے بارے
اسلامی احکام معلوم کرنے کے درپے نہ ہوں اور یوں ہی ان پر عامل
رہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ ان مسائل کی حد تک ہماری زندگی

غیر اسلامی ہو جائے گی بلکہ یہ خطرہ دامنگیر ہے کہ ہم دیگر امور حیات میں بھی رفتہ رفتہ اسلام کی شاہراہ سے ہٹتے جائیں گے اور ہمارے دل سے اسلامی احکام کو معلوم کرنے کا احساس مٹ جائے گا۔ حالانکہ مسلمان کا کوئی قدم بھی اسلامی شاہراہ کے بغیر نہیں اٹھنا چاہیئے۔ انسانی زندگی ترقی و تغیر کی جن منزلوں سے گذرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی ایسا نہیں آتا جہاں مسلمان کو اسلام سے فتویٰ نہ پوچھنا پڑے لہذا کسی مسلمان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اجتہاد کے بغیر اپنی مذہبی زندگی کو برقرار رکھ سکے۔

اسلام کے معاشی اصول

سوال ۱:۔ معاشی مسئلہ کی اہمیت و ضرورت پر ایک مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔

جواب: معاشیات کی اہمیت ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی رہی ہے مگر دورِ حاضر کے گوناگوں مسائل نے اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے کیونکہ آج کے مشینی دور میں سائنس کی بے پناہ ترقی اور حیرت انگیز ایجادات اور زرعی صنعتی اور تجارتی میدانوں میں ارتقاء کے باوجود انسانوں کی اکثریت پہلے کی طرح ضروریاتِ زندگی سے محروم ہے بلکہ غربت و افلاس، بے روزگاری و بیکاری اور معاشی و معاشرتی ظلم و ستم کا شکار ہے۔

دراصل ذرائع پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسانی آبادی کی کثرت انسانوں کی خود غرضی و لالچ، مادہ پرستانہ زینت اور عیش و عشرت کے رجحانات بھی بڑھتے چلے گئے ہیں۔ یہ تمام برائیاں اور خرابیاں مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں۔ آخر ان کے ردعمل میں انتہا پسند مادی نظریہ اشتراکیت نے جنم لیا مگر معاشی مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہو سکا۔ غریب طبقہ پھر بھی غریب ہی رہا۔ اور ان تمام کوششوں اور ترقی کے باوجود انسان مجموعی خوشحالی سے محروم رہا ہے۔

چنانچہ اس دور میں معاشی مسئلہ ایک انفرادی مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ مسئلہ اب ملکی و قومی حیثیت سے درپیش ہے اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو پوری دنیا کو اس کا سامنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں معاشی مسئلہ سیاسی معاملات

پر اس حد تک اثر انداز ہو رہا ہے کہ معاشی استحکام کے بغیر کسی قوم و ملک کو سیاسی استحکام بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی معاشی آزادی کے بغیر کوئی قوم و ملک سیاسی طور پر آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ بالخصوص پسماندہ ممالک جن میں اکثریت مسلم ممالک کی ہے اس مسئلہ سے بری طرح دوچار ہیں۔

لہٰذا نہ صرف بحیثیت ایک آزاد مملکت کے فرد ہونیکے بلکہ بحیثیت مسلمان بھی ہمیں معاشی مسئلہ پر غور و فکر اور جدید مسائل کے پیش نظر اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ معاشی مسئلہ وقت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا معقول حل وقت کی اہم ضرورت ہے۔

سوال ۲۵:۔ معاشی خوشحالی سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً بحث کیجئے

جواب: معاشی خوشحالی و فارغ البالی سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جائے جو ہر اعتبار سے معتدل، متوازن، خوشحالی و بہتر ہو اور جس کی بنیاد باہمی عدل و انصاف اخوت و مساوات اور ہمدردی و خیر خواہی پر ہو۔

معاشی خوشحالی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ محض پیداوار بڑھائی جائے یا صنعتی ترقی میں اضافہ کر لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے بھی معاشی خوشحالی کا حصول ممکن نہیں یہ عین ممکن ہے کہ ایسا ہونے پر تمام پیداوار اور اس کے وسائل و ذرائع پر چند خود غرض افراد قابض ہو جائیں اور انجام کار معاشرے میں خوشحالی کی بجائے بدحالی کا دور دورہ ہو اور بغض و حسد اور طبقاتی نفرت کے جذبات ابھرنے لگیں۔ لہٰذا معاشی خوشحالی کا اصل مفہوم ایک بہتر و ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے۔ چنانچہ پروفیسر دی ڈیمنٹ (V.DEMENT) اپنی کتاب ریلیجن اینڈ دی ڈیکلائن آف کیپٹلزم میں لکھتا ہے۔

"صنعتی ترقی اس معاشرے کی خوشحالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی
زرعی بنیادیں مستحکم ہوں۔ بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور
جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو"

گویا معاشی خوشحالی کیلئے تین چیزیں درکار ہیں ایک زرعی بنیادوں کا استحکام دوسرے بنیادی اور گھریلو صنعت و حرفت کی مضبوطی اور تیسرے روحانی قوت کی موجودگی لیکن ان اسباب کی موجودگی کے باوجود بھی معاشی خوشحالی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بلکہ اس مرحلے پر پہنچ کر افراد کے فطری تعلقات کمزور ہونے لگتے ہیں اور زندگی کا معیار بھی بڑھنے کی بجائے گھٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک بہتر معاشی نظام کا یہ اسلوب ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی انفرادی و اجتماعی سرگرمیوں کو مناسب حد تک بڑھائے اور انہیں مثبت اور تعمیری روش پر ہی رکھے۔ ان سرگرمیوں کا مقصد صنعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ کی بجائے۔ زندگی کے بلند مقاصد اور اعلیٰ اقدار کا حصول ہونا چاہیئے۔ کیونکہ در حقیقت معاشی خوشحالی کا مقصد بھی پورے نظام زندگی کی اصلاح و ترقی ہے اس لئے محض چند جزوی و ضمنی تبدیلیاں مفید نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ پورے معاشی نظام میں ایسی ہمہ گیر انقلابی تبدیلی ضروری ہے۔ جو تعمیری و تخلیقی پہلو لئے ہوئے ہو۔ چنانچہ مشہور ماہر معاشیات فرینکل کا کہنا ہے۔

"حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو انفرادی اور سماجی عمل ہے
جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات اس طور پر نئے
سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کی
کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے
لگتے ہیں۔"

دراصل بقول ماہر معاشیات ڈومر معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے۔ معاشرے کا فطری و طبعی ماحول سیاسی خدوخال، تعلیمی و قانونی نظام وغیرہ معاشی ترقی پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی ترقی معاشرتی تبدیلیاں اور دیگر نظریات بھی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا ہمارے سامنے محض پیداوار میں اضافہ یا صنعتی ترقی نہ ہونا چاہیئے بلکہ ایسی معاشی خوشحالی و ترقی کو حاصل کرنا چاہیئے جس کے بنیادی اوصاف حسب ذیل ہوں :-

(ا)- ترقی درست سمت میں ہو (ب) ترقی تیز رفتار ہو۔ (ج) ترقی صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور اس ترقی کے نتائج بھی صحیح نکلیں۔

لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے پورے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی نظاموں میں ایسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو معاشرے کی صحتمند و صالح قدروں پر استوار کریں۔ بالخصوص معاشی نظام کو انسانی قدروں کی بنیاد پر استوار کرنا ضروری ہے تاکہ سرمایہ دار و مزدور اور زمیندار و کاشتکار کے مابین خوشگوار تعلقات بحال ہوں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

(ا) معاشی خوشحالی صرف بہتر معاشی نظام سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ب) پسماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور معاشی ترقی کے حصول کے لئے اسے تبدیل کرنا اشد ضروری ہے۔

(ج) اس نظام کی جگہ ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری دینی و سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔

(د) وہ نظام جس میں یہ خوبیاں پائی جائیں صرف "اسلامی نظام" ہی ہے۔ لہٰذا معاشی خوشحالی کا حصول صرف "اسلام نظام" ہی میں ممکن ہے۔

اسلام کے معاشی اصول

سوال ۱۳: اسلام کا معاشی نظام کن اصولوں پر قائم ہوتا ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: اسلامی معاشی نظام کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اسلامی معاشی نظام کی سب سے اولین بنیاد یہ ہے کہ اسلام میں معاشی سرگرمیاں مذہب و اخلاق سے الگ نہیں بلکہ معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کی پابندی اور اخلاقی ضابطوں کا احترام سکھاتا ہے۔ اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان معاشی تگ و دو کے ساتھ ساتھ خدا کے ذکر میں مصروف رہے اور اس کی اطاعت و رضا جوئی حاصل کرتا رہے۔

(۲) اسلام کے معاشی نظام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کی معاشی جدوجہد اس کا بنیادی جز ہے۔ اسلام پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیتے ہوئے اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ حصول معاش کے لئے زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرے۔ بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور مثبت طور پر رزق کی تلاش ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے احکام صرف عقائد و عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ معاملات یعنی تجارت و صنعت اور زراعت و ملازمت وغیرہ بھی اس کے دائرہ عمل میں ہیں۔ اور قرآن و سنت میں بھی ان کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) اسلامی نظام معیشت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ اسلام پیداوار

پیداوار اور معاشی فروغ کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کی تمیز کو بھی لازم ٹھہراتا ہے۔ اسلام ذرائع آمد پر اس بات کی کڑی شرط عائد کرتا ہے کہ اسے جائز ذرائع سے حاصل کیا جائے اور ہر وہ نفع جو حرام ذرائع سے حاصل ہو اسے وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے غصب، ڈاکہ، چوری، دھوکہ دہی، قمار بازی، سود خوری، سٹہ وغیرہ ذرائع آمدن کو ناجائز قرار دیا ہے قرآن و احادیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام صرف جائز اور حلال رزق کی کوششوں کو فروغ دیکر ایک فلاحی معیشت وجود میں لانا چاہتا ہے۔

(۱۴) اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں ایک حرمت سود بھی ہے۔ اسلام سود کی حرمت پر بہت زور دیتا ہے اور اسے ہر شکل میں حرام قرار دیتا ہے۔ سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نتائج بھی بے حد خطرناک ہیں۔ سود کی بنیاد استحصال زر اور ظلم و تعدی پر ہے اور اس کی وجہ سے ملکی دولت صرف چند سرمایہ داروں کے پاس مرتکز ہو جاتی ہے اور اس طرح پورا معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

(۱۵) اسلامی معاشی نظام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس نے لین دین، خرید و فروخت اور تجارت کے لئے ایک ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے۔ اسلامی نظام معیشت کی بنیاد خوف خدا اور امانت و دیانت رکھی گئی ہے تجارت باہمی رضامندی سے اور صرف جائز و مباح اشیاء میں ہونی چاہیئے۔ ذخیرہ اندوزی، جوا اور سٹہ کی اسلام نے سختی سے ممانعت کی ہے۔ اسلام یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ تاجر کو خوش خلق، خدا ترس، سچا دیانتدار

اور اعلیٰ اخلاقی کردار کا حامل ہونا چاہیئے۔

(۶) اسلامی نظام معیشت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اسلام طلب معاش کے حلال ہونے کے ساتھ ساتھ مصارف دولت کے جائز ہونے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ نیز اسراف و فضول خرچی سے بھی سختی سے روکتا ہے کیونکہ یہی چیز بالعموم دولت کے ضیاع، بے انصافی اور ظلم کا باعث بنتی ہے۔

(۷) اسلامی معاشی نظام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام ارتکاز دولت کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ اسلام دولت کے ایک یا چند ہاتھوں میں جمع ہونے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرے اور اس کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے ارتکاز دولت کو روکنے کے لئے زکوٰۃ، صدقہ و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ اور وراثت کے قوانین دیئے ہیں اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ضرورت سے زائد مال معاشرے پر خرچ کر دیا جائے۔

(۸) اسلامی نظام معیشت کا یہ بھی اصول ہے کہ اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو خدا کی ملکیت قرار دیکر اس کے تحت انسان کو انفرادی تصرف و ملکیت کا حق دیتا ہے۔ اس طرح اسلام انفرادی ملکیت کو ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے حق کو بہت سی اخلاقی و قانونی پابندیوں سے محدود کرتا ہے تاکہ ظلم و تشدد کی صورت پیدا نہ ہو۔

(۹) اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اسلام اس سے فلاحی ریاست قائم کرتا ہے۔ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ تمام شہریوں کو

بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ ناداروں، اپاہجوں، محتاجوں اور ایسے افراد جن کا کوئی ولی نہ ہو ان کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد کرتا ہے اور اس طرح وہ عدل اجتماعی کو قائم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی نظام معیشت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی و اخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی عدل شخصی آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے اصولوں اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف اور اعلیٰ اور برتر ہے۔

سوال ۱۲ :- اسلام کے نقطہ نظر سے معاشیات اور مذہب و اخلاق کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالئے۔

جواب :- اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور جس طرح زندگی کے باقی تمام شعبوں کے بارے میں ہدایات دیتا ہے اسی طرح معاشیات کے متعلق بھی احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے معاش، دین کا ایک حصہ ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے مال کو "خیر" اور معاش کو "فضل اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝	اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کیلئے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کیطرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر

کثرت سے کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(الجمعہ : ۹-۱۰)

ان آیات میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہ سب نعمتیں جو انسان کو میسر ہیں خدا تعالیٰ کی عنایت ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اپنی معاشی زندگی میں خدا تعالیٰ کے احکام و قوانین کی پابندی کرے تاکہ اس کے مفاد کے ساتھ معاد بھی بہتر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر معاشی جدوجہد میں حدود ربانی کی پابندی کرے تو نہ صرف یہ کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ عبادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور ہر وہ قدم جو انسان حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے فکر معاش کے لئے اٹھاتا ہے اس کے عوض نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب انسان مادہ پرستی اور عیش کوشی میں مبتلا ہو کر ذکر الٰہی اور اصل فرائض سے غفلت برتنے لگتا ہے تو قابل مذمت ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے جہاں انسان معاشی جدوجہد کو ضروری قرار دیا ہے وہاں اسے اخلاقی ضابطوں کا پابند بھی کیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اچھے مسلمانوں کا کردار یوں بیان کیا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ

وہ لوگ جنہیں کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل نہیں کرتے۔ (النور: ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام معاش کو دین و مذہب سے الگ نہیں کرتا بلکہ معاشی قوانین کو مذہب و اخلاق کی حدود میں رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ خرید و فروخت قرض، سود، معاہدات، دستاویزات اور شہادت وغیرہ کے احکام جا بجا بیان

ہوئے ہیں۔ اگر معاشیات کا تعلق اخلاق و مذہب سے نہ ہوتا تو پھر یہ احکام قرآن پاک میں کیونکر بیان کئے جاتے۔ پھر قرآن پاک میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا گیا ہے جو تجارتی اخلاق و ضوابط کی پابندی نہ کرنے کی بنا پر عذاب الٰہی کا شکار ہوئی۔

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام معاشیات کو مذہب و اخلاق سے ہم آہنگ کرتا ہے اور اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز اخلاقیاتی ہے۔

سوال ۵:۔ معاشی جدوجہد کو اسلام میں کیا مقام حاصل ہے؟ اسکے مقاصد بھی تحریر کیجئے

جواب: حصول معاش کیلئے جدوجہد فطری تقاضا ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہے۔ انسان کے اس فطری تقاضے کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ تلاش معاش کو فریضہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب حلال کو "فریضۃ بعد الفریضۃ" یعنی عبادت کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا۔

دراصل اسلام کے نقطۂ نظر سے پوری کائنات انسان کے لئے میدان عمل ہے اور انسان کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ حصول معاش اور بنی نوع انسان کی خوشحالی و فارغ البالی کے لئے اس میں جدوجہد کرتا رہے۔ گویا اسلام تکثیر پیداوار یعنی پیداوار کو زیادہ بڑھانے پر زور دیتا ہے۔ یہی چیز اسلام کو سرمایہ داری سے ممیز کرتی ہے کیونکہ سرمایہ داری میں اہمیت منافع کی تکثیر کو حاصل ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ نظام صرف منافع بڑھانے پر زور دیتا ہے جبکہ اسلام کل پیداوار کو بڑھانے اور سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی چاہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا — اور البتہ ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی

لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ۔

اور اسی میں تمہارے لئے سامان معاش مہیا کیا۔ (الاعراف: ۱۰)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ط

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر بہا دی ہیں (لقمان: ۲۰)

اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد کہ تمام اللہ نے زمین اور پوری کائنات کی نعمتیں خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں۔ اسلام حصول معاش اور کسب حلال کے لئے محنت اور جدوجہد کی انسان کو تعلیم دیتا ہے۔ اسلام ہر شخص کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ کثیر پیداوار اور سامان معیشت کو بڑھانے کے لئے سرگرم عمل رہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور احادیث میں کئی طرح سے اس جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے ان تمام باتوں سے منع کیا گیا ہے جن سے حصول معاش کا جذبہ سست پڑتا ہو۔ چنانچہ بے عملی بے روزگاری اور گداگری کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے اور ان پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بیکار بیٹھے رہنا مومن کے شایان شان نہیں اور نہ یہ اسے زیب دیتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور صرف دعا مانگتا رہے کہ اللہ مجھے رزق عطا کر۔ بلکہ دعا کے ساتھ عملاً بھی جدوجہد کرنی لازم ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے تو سونا چاندی نہیں برستا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گداگری عزت

دنا موس پہ بدنما داغ ہے۔ گداگر کے چہرے پر قیامت کے روز گوشت نہیں ہوگا۔" ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "قیامت کے دن گداگری کا داغ چہرے پر لے کر آنے سے بہتر ہے کہ تم کام کرو" حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسی اور کلہاڑی لے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اور معاش کا انتظام کرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے۔ کیونکہ مانگنے والے کو دینا یا نہ دینا لوگوں کے بس میں ہے مگر محنت کرنے والا لازما روزی حاصل کر لیتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا رہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل وعیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن ہوگا۔

(۲) اس کے ساتھ ساتھ قرآن و احادیث میں حصول رزق اور تلاش معاش کی مثبت طور پر ترغیب دی گئی ہے اور کسب حلال کو ہر مسلمان پر فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا۔ — جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ۔ (البقرہ)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ — اور دنیا سے اپنا حصہ بھول نہ جاؤ۔ (القصص ۷۷)

ایک اور جگہ فرمایا۔

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا۔ — اور خدا نے جو حلال و پاکیزہ چیزیں تمہیں بطور رزق دی ہیں انہیں کھاؤ۔ (المائدہ ۸۸)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق حلال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔
نِعْمَةَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ   نیک آدمی کے لئے اچھا مال کیا ہی اچھی چیز ہے
ایک دوسری حدیث میں فرمایا:۔
طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ   رزق حلال کی تلاش عبادت الٰہی کے
بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ   بعد فرض ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد رزق کی تلاش کیا کرو اور غفلت کی نیند نہ سوتے رہو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت مالداری اور سخاوت ہے اور دین کی شرافت تقویٰ و پرہیز گاری ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ " صنعت و حرفت سے روزی کمانا انسان پر فرض ہے۔" آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "روزی کمانے کی جدوجہد میں مغموم و متفکر رہنا بعض گناہوں کا کفارہ ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول معاش اور کسب حلال پر جو تاکید کی ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر سوال کیا۔ آپ نے اسے کسب حلال کی ترغیب دی اور پوچھا تمہارے پاس کیا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چادر۔ آپ نے یہ دونوں چیزیں فوراً فروخت کر کے بازار سے کلہاڑی اور لکڑی منگوائی اور پھر اپنے دست مبارک سے کلہاڑی کا دستہ لگا کر اس کے حوالہ کیا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ کچھ روز بعد وہ شخص آیا تو اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا اور وہ خوشحال نظر آتا تھا۔

اسلام کے انہی احکام کی روشنی میں ہمارے فقہاء نے معاشی جدوجہد کو

فرض عین (جو ہر شخص پر لازم ہو) اور تکثیر پیداوار کو فرض کفایہ (جو فرض تو سب پر ہو مگر جب کچھ لوگ ادا کر دیں تو سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں) قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ردالمحتار" میں ہے:

وَمِنْ فُرُوضِ الْكِفَايَةِ الصِّنَاعَةُ الْمُحْتَاجُ إِلَيْهَا ضروری صنعتوں کو قائم کرنا فرض کفایہ ہے

اسی طرح فقہ شافعی کی مشہور کتاب "المنہاج" میں ہے:

وَمِنْ فُرُوضِ الْكِفَايَةِ الْحِرَفُ وَالصَّنَائِعُ وَمَا يَتِمُّ بِهِ الْمَعَاشُ	صنعت و حرفت اور وہ تمام چیزیں جو ہمیں معاش کے لئے ضروری ہیں فرض کفایہ ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں مختلف فقہاء کی آراء کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بہت سے شافعی، حنبلی اور دوسرے فقہاء مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام جوزی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا قول ہے کہ جس طرح جہاد فرض کفایہ ہے۔ اسی طرح صنعت و حرفت کا قیام بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ ان کے بغیر معاش کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔"

قرآن و سنت کے ارشادات اور فقہائے اسلام کے اقوال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاش انسانی ضروریات میں سے ہے اور معاش ہی کی تکمیل انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح انسان کی روحانی و اخلاقی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اور طاغوتی غلبے اور منکرات سے اپنے آپ کو بچایا جائے اسی طرح جسمانی و مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے صنعتوں کا قیام اور تلاش معاش لازمی ہے۔ اسلام دین اعتدال ہونے کے اعتبار سے انسان کی روحانی و مادی دونوں قسم کی ضروریات کو یکساں اہمیت دیتا ہے اور ملوکیت کے خلاف جہاد اور حصول معاش دونوں کو فرض کفایہ ٹھہراتا ہے۔

معاشی جدوجہد کی اہمیت و مقام واضح کرنے کے بعد اسلام اس کے بعض مقاصد بھی متعین کرتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے معاشی جدوجہد کا سب سے اولین مقصد تمام انسانوں کو وسائل معاش فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو وسائل زندگی عطا کئے ہیں انہیں ترقی دی جائے اور پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ پھر رزق کے خزانوں کو صرف چند ہاتھوں میں محدود نہ رکھا جائے بلکہ ہر دولتمند ضرورت سے زائد دولت کو ضرورتمندوں میں تقسیم کرے اور اسطرح دولت افراد معاشرہ کے درمیان گردش کرتی رہے۔ گویا اسلام معاشیات کی اصطلاح کے مطابق تکثیر پیداوار اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کا تقاضا کرتا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کو معاش فراہم ہو سکے یہی اسلامی نظام معیشت کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"اولاد آدم کا یہ بنیادی حق ہے کہ رہنے کیلئے گھر، جسم ڈھانپنے کیلئے کپڑا، کھانے کیلئے روٹی اور پینے کیلئے پانی میسر ہو۔"

حصول معاش کے مواقع میسر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام معیشت کا ایک اہم مقصد غربت و افلاس کا خاتمہ ہے۔ اسلام کا اولین مقصد کفر کا استیصال ہے اور غربت و افلاس اور فقر و فاقہ انسان کو کفر پر آمادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اسلام ایسی معاشی پالیسیاں فراہم کرتا ہے جن سے غربت و افلاس کا مکمل طور پر انسداد ہو سکے تاکہ محتاجی کے سبب کفر نہ ابھرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا

قریب ہے کہ محتاجی انسان کو کفر تک لے جائے

دیکھا یہ گیا ہے کہ انسان بعض اوقات غربت و افلاس کے خوف سے
اور معیار زندگی کے پست ہونے کے ڈر سے قتل اولاد اور نسل کشی کا ارتکاب
کرتا ہے۔ اسلام اس منفی رویے کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اس نسل کشی
اور انسان کشی کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝	اور اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ یقیناً ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے (بنی اسرائیل: ۳۱)

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رازق حقیقی خدا تعالیٰ نے
تمام بنی نوع انسان کو رزق فراہم کرنے کی ذمہ داری لی ہے اور اس نے اس
کائنات میں سب کیلئے رزق پیدا کیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ قلت
وسائل کا واویلا کرنے کی بجائے تلاش معاش کے لئے جدوجہد کرے۔ چنانچہ
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "رزق کا دروازہ فرش سے عرش
تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معاش غیر محدود ہیں۔"

اسلام تلاش معاش کی ذمہ داری امیر غریب اور مرد عورت سبھی پر
ڈالتا ہے تاکہ پورا معاشرہ خوشحالی و فارغ البال ہو سکے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا ارشاد ہے کہ عورت کو گھر میں بیکار بیٹھے رہنے کی بجائے چرخہ کاتنا بہتر
کمائی کا موجب ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں
کو بکریاں پالنے اور غریبوں کو مرغیاں پالنے کا حکم دیا ہے تاکہ فارغ البالی حاصل ہو۔
مختصر یہ کہ اسلام عبادات اور دیگر احکام کی طرح حصول معاش پر بھی
تاکید کرتا ہے اور اسے ہر شخص کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسلام ہر شخص کی توجہ

اس امر پر مبذول کراتا ہے کہ بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم معاشی وسائل کو ترقی دیں اور پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں تاکہ غربت افلاس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ ہر شخص کو معاش میسر ہو اور پورہ انسانی معاشرہ خوشحالی و فارغ البال نظر آئے۔

سوال ۲۶: اسلام نے معاش پر حلال و حرام کی کیا کیا پابندیاں عائد کی ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کو فروغ دینا ہی نہیں بلکہ ان کی منصفانہ و عادلانہ اور مصلحانہ تقسیم بھی ہے۔ اس لئے اسلام معاشی جدوجہد اور حصول معاش پر حلال و حرام کی پابندیاں، عائد کرتا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے ہر پاک اور مفید چیز جائز اور حلال ہے اور ہر ناپاک اور مضر چیز ناجائز اور حرام ہے۔ اسی لئے اسلام لوگوں کو کسب حلال کا پابند کرتا ہے تاکہ وہ نقصان سے بچے رہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۔ — اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ۔

(البقرۃ: ۱۶۸)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں کسبِ حلال کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا "بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے"۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "رزق حلال کی تلاش ایسے ہے جیسے خدا کی راہ میں جہاد و قتال ہے اور رزق حلال کی تلاش میں تھک کر رات کو سو جانے والے سے اللہ راضی ہے"۔ اس کے برعکس حرام روزی کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ "حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت (دوزخ کی) آگ میں ڈالے جانے کا زیادہ مستحق ہے"۔ پھر حرام

روزی کمانے والوں کو حضور علیہ السلام نے ان الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی"

قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جس قدر اہمیت بیان کی گئی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز و حلال طریقے فروغ پیداوار اور حصول معاش کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا پوری طرح سدباب کیا جائے گا جنہیں شریعت حرام قرار دیتی ہے۔ دراصل اسلام بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح چاہتا ہے۔ لہٰذا اس میں رزق حرام کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ حرام روزی سے ظلم و ستم، حق تلفی، دھوکہ دہی اور دیگر مفاسد پھیلتے ہیں اور فرد اور معاشرے کی جسمانی و اخلاقی زندگی مجروح ہوتی ہے۔

الغرض اسلام اپنے معاشی نظام میں حلال و حرام کی پابندی عائد کرکے انسانوں میں معاشی تعاون و مساوات، عدل و انصاف، قسط و توازن اور آزادی جدوجہد کو فروغ دیتا ہے تاکہ حقیقی فلاحی معیشت قائم ہو سکے۔

سوال ۱۰:۔ حرمت سود کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ قلمبند کیجئے۔

جواب :۔ اسلام رزق حلال اور جائز کمائی پر زور دیتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ دولت صرف حلال ذرائع سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ اسلام حرام کمائی کے تمام ذرائع سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے۔ بالخصوص ربٰو یا سود جو ناجائز کمائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

سود سرمایہ دارانہ معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ سب سے بڑا معاشی ظلم اور ایک عظیم تہذیبی ڈاکہ ہے۔

لہٰذا اسلام سود کی ہر شکل اور ہر قسم کو قطعاً اور مطلقاً حرام قرار دیتا ہے۔ سود مفرد ہو یا مرکب۔ ذاتی ضرورت کے قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی و پیداواری قرضوں پر ہر صورت میں حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ (البقرۃ : ۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ایک دوسری جگہ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

(آل عمران : ۱۳۰)

اے ایمان والو! سود کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔

سود کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ بھی ایک تجارت ہے کیونکہ سود قرضخواہ اپنے قرض دار سے رقم کے استعمال کے معاوضہ کے طور پر وصول کرتا ہے حالانکہ دونوں کی حیثیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ قرضدار اکثر اوقات اپنی کسی مجبوری کی بناء پر قرض لیتا ہے۔ اور اگر کاروبار کے لئے قرض لیا جائے تو اس میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ حالانکہ سود میں نفع ہی نفع پیش نظر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا

(البقرۃ : ۲۷۵)

وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

قرآن پاک نے سود کی اس شدت سے حرمت بیان کی ہے کہ جو لوگ سود خوری سے باز نہیں آتے ان کے خلاف اللہ اور اسکے رسول کی جانب سے جہاد کا اعلان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (البقرۃ : ۲۷۹)

پس اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ۔

اس سے بڑھ کر قرآن پاک نے سود خوروں کا انجام بڑا ہولناک بیان کیا ہے کہ وہ قیامت کے روز پاگلوں کی طرح بہکے اور لڑکھڑاتے ہوئے اٹھیں گے فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ (البقرۃ : ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں نہ کھڑے ہوسکیں گے مگر اسطرح جیسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔

احادیث میں بھی سود کی حرمت اسی طرح بیان ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا عقد لکھنے والے اور سود کے گواہوں سب پر لعنت فرمائی ہے۔ اور ان سب کو گناہ میں برابر شمار کیا ہے آپ نے سود سے اس حد تک بچنے کی تلقین فرمائی ہے کہ آپ نے قرضخواہ کو قرضدار سے ہدیہ لینے سے بھی منع فرما دیا چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "جب کوئی کسی کو قرض دے تو پھر قرض لینے والے سے کوئی ہدیہ قبول نہ کرے"۔

اسلام میں سود کی حرمت محض اخلاقی بناء پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہ سود کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نتائج بھی بے حد خطرناک ہیں۔ سود کی وجہ سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور معاشرے کی ساری معیشت چند سود خور

مہاجنوں کے ہاتھوں میں سمٹ جاتی ہے اور باقی معاشرہ غربت و افلاس کا شکار ہو جاتا ہے اور یہی چند سرمایہ دار پورے معاشرے پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس سے انتشار و اضطراب پھیلتا ہے اور نفرت و کدورت اور حسد و بغض جنم لے کر پورے معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی قدیم معاشروں کی تباہی و بربادی میں سود کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور آج بھی اکثر معاشروں کی جڑوں کو یہ کھوکھلا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سود کو مکمل طور پر ختم کرتا ہے۔

سوال ۶:۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے تجارتی اخلاقیات کے ضابطہ پر روشنی ڈالیے۔

جواب:۔ اسلام کا معاشی نظام دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس نے تجارتی کاروبار کے لئے اخلاقیات کا ایک ضابطہ مقرر کیا ہے تاکہ صالح اور منصفانہ معیشت فروغ پا سکے اور افراد اور معاشرہ کے باہمی تعلقات خوشگوار ہوں۔ اسلام کے تجارتی اخلاقیات کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱:۔ باہمی رضامندی اسلام میں تجارت اور لین دین کی بنیاد باہمی تعاون و رضامندی پر رکھی گئی ہے۔ یعنی فریقین اپنے معاملات بغیر کسی جبر و اکراہ کے آزادانہ اپنی مرضی سے طے کریں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ (النساء: ۲۹)

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر باہمی رضامندی سے تجارت ہو تو درست ہے۔

اسی آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام صرف باہمی رضامندی سے کئے گئے کاروبار کو جائز قرار دیتا ہے اور اس کے برعکس ایسے تمام لین دین جو ظلم و زیادتی حق تلفی و دھوکہ دہی اور مکر و فریب وغیرہ باطل ذرائع پر مبنی ہوں ناجائز و ممنوع ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح معاملات کی وہ تمام صورتیں جن میں کمزوری و مجبوری یا بےبسی سے فائدہ اٹھایا گیا ہو ناجائز ہیں۔ اسی اصول کے تحت ایسے اشتہار یا نفسانی حربوں کا استعمال بھی ممنوع ہے جو لوگوں کی عقل کو معطل کر دے اور ان کی آزاد مرضی پر اثر انداز ہو ہر تجارتی منڈی کی آزادی میں خلل ڈالنے والا ہر وہ حربہ بھی ناجائز ٹھہرتا ہے جس سے عموماً سرمایہ دار وقتاً فوقتاً مصنوعی قلت یا بحران پیدا کر کے اپنے ہاتھ رنگتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلامی تجارت کا اولین اصول فریقین کی باہمی رضامندی اور اس آزادانہ لین دین پر اثر انداز ہونے والے تمام حربے ناجائز و ممنوع ہیں۔

۲:- **دیانت داری** اسلامی تجارت کا دوسرا اصول دیانت داری ہے یعنی لین دین کا ہر معاملہ صاف صاف کھلا کھلا اور برسرعام ہونا چاہیئے۔ مال کی اصل کیفیت گاہک کے آگے رکھ دینی چاہیئے۔ اور کسی قسم کا دھوکا و فریب نہ ہو۔ تجارت کو فروغ دینے کے خفیہ ہتھکنڈے اختیار کرنا اور لوگوں کو غلط فہمی میں رکھ کر سودا فروخت کرنا ناجائز ہے۔ غرض ہر وہ معاملہ جس میں دوسروں کا نقصان مدنظر ہو مثلاً ناپ تول میں کمی، معاملے پہ معاملہ کرنا وعدہ خلافی کرنا۔ خیانت اور بددیانتی ہے اور ناجائز ہے۔

تجارت میں امانت و دیانت کی اہمیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ — سچ بولنے والا امانتدار اور تاجر

النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ (ترمذی شریف) (قیامت کے روز نبیوں صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

۳:- جائز اشیاء کی تجارت

اسلامی تجارت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت کی جائے وہ نفسہٖ جائز و حلال ہو۔ ہر وہ چیز جس کا استعمال ناجائز و حرام ہے اس کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے۔ مثلاً شراب، سوّر، مردار، بت وغیرہ۔ چنانچہ جب حرمت شراب کا حکم آیا تو بعض صحابہ نے جو شراب کی تجارت کرتے تھے اسے فروخت کر دینے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ "آب شراب حرام کر دی گئی ہے اور اسکی قیمت بھی"۔ یہی حکم دوسری حرام اشیاء کے لئے ہے۔

۴:- احتکار کی ممانعت

اسلامی تجارت کا ایک اہم اصول احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ ضروریات زندگی کو اس لئے روک رکھنا کہ ان کی قیمتیں بڑھ جائیں اور نفع زیادہ حاصل ہو احتکار یا ذخیرہ اندوزی کہلاتا ہے اور اسلام میں اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار کو ناجائز ٹھہرایا ہے اور اسکے مرتکب پر لعنت بھیجی ہے۔

۵:- جوا اور سٹہ کی ممانعت

اسلامی تجارت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہر وہ ذریعہ جس سے بغیر مناسب محنت اور بغیر کسی بدل کے ایک فریق کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان پہنچتا ہو ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے انتشار و اضطراب پھیلتا ہے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جوا، سٹہ، لاٹری اور قمار بازی کی دیگر تمام صورتیں اسلام میں ناجائز و ممنوع ہیں۔

۵:۔ تاجروں کا ذاتی کردار اسلامی تجارت کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ اسلام تاجروں کو اعلیٰ اخلاق و کردار پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ تاجر ایسے اخلاق و کردار کے حامل ہوں کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کی صحیح نمائندگی کریں۔ ان میں دولت جمع کرنے کی ہوس کی بجائے خوش اخلاقی اور لوگوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے اور اپنے کاروبار کو پوری محنت۔ دلجمعی اور مستقل مزاجی سے انجام دینا چاہیئے تاکہ وہ تجارت کا صحیح حق ادا کر سکیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام دنیا کے بہت سے ممالک میں مسلمان تاجروں کی بدولت پہنچا۔ مسلمان تاجر جہاں بھی جاتے لوگ ان کی سچائی، دیانت۔ ہمدردی۔ خوش خلقی اور خدا خوفی سے متاثر ہو کر قبولِ اسلام پر آمادہ ہو جاتے چنانچہ انڈونیشیا۔ ملائیشیا۔ برما۔ لنکا اور چین وغیرہ ممالک اور برصغیر پاک و ہند کے ساحلی علاقوں میں انہی تاجروں کی بدولت اسلام کی اشاعت ہوئی۔

معاش اور اخلاق میں یہی وہ توازن ہے جو اسلامی نظام معیشت کا طرۂ امتیاز ہے۔

سوال ۷۹:۔ اسراف و تبذیر کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جواب:۔ اسلام جس طرح طلب معاش پر جائز و حلال ہونے کی پابندی عائد کرتا ہے اسی طرح دولت کو جائز مصارف پر خرچ کرنے کا بھی تقاضا کرتا ہے اور اسراف و تبذیر سے روکتا ہے۔ اسراف کے معنی فضول خرچی یعنی ضرورت سے زیادہ خواہ مخواہ خرچ کرنا ہے۔ اور تبذیر کے معنی بے جا صرف کرنا یعنی ناجائز امور پر خرچ

کرتا ہے۔ قرآن پاک نے ان دونوں کی ممانعت کی ہے۔ فرمایا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔

(الاعراف: ۳۱)

دوسری جگہ فرمایا

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط (الاسراء: ۲۶-۲۷)

اور بے جا خرچ نہ کرو۔ بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اسراف و تبذیر کو اسلام نہ صرف اس لئے روکتا ہے کہ ان سے قومی دولت کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا مقصد نام و نمود اور نمائش و ریاکاری ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے کہ "جو شخص جائز ضروریات پورا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو شخص آن بان کے لئے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔"

درحقیقت اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت کو بے جا اور ناجائز خرچ کرنے کی بجائے اسے تعمیری اور مفید کاموں پر خرچ کیا جائے۔ اسی لئے اسلام میں اسراف و تبذیر کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

سوال ۸:۔ ارتکاز دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیجئے اور بتائیے کہ اس کا سدباب کرنے کے لئے اسلام نے کیا کیا صورتیں تجویز کی ہیں۔

جواب:۔ اسلام دولت کی گردش کا قائل ہے۔ اور ارتکاز دولت یعنی دولت

کے ایک یا چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے مختلف اخلاقی۔ معاشرتی۔ اور قانونی تدابیر سے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرے اور اس کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ و عادلانہ ہو۔ قرآن پاک نے اس سلسلے میں فرمایا ہے :۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر ۱ ۷) — تاکہ دولت تمہارے مالداروں کے پاس ہی نہ رہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بارے میں ارشاد فرمایا۔

اَقْسِمُوا الْمَالَ بَيْنَ الْفَرَائِضِ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ، (ابوداؤد شریف) — مال کو مقررشدہ حصوں میں کتاب اللہ کے مطابق تقسیم کردو۔

ارتکاز دولت کو روکنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لئے اسلام نے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے اور یہ صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ زکوٰۃ سونا۔ چاندی۔ نقدی۔ مال تجارت دفینہ۔ اور صنعتی پیداوار اور مویشیوں وغیرہ پر عائد ہوتی ہے۔ صاحب نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس مال کی ایک خاص مقدار جمع ہو جائے اور پھر اس میں سے اسے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف بھی قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں اور یہ محتاج۔ مصیبت زدہ معذور اور معاشرہ کے گرے پڑے لوگوں کو ادا کرنا ہوتی ہے۔ یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقراء ومساکین کا حق ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ — ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ مال و دولت صرف اسی کا نہیں جو اسے کمائے بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو کمانے سے عاجز ہیں۔ مثلاً یتیم ولاوارث۔ بیوہ و بےسہارا۔ اپاہج و دائمی بیمار اور تمام وہ لوگ جو کسی نہ کسی وجہ سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ کیونکہ کسب مال میں صرف کمانے والے کی محنت و قابلیت ہی سب کچھ نہیں بلکہ اس میں قدرت کی بے شمار کھلی و پوشیدہ قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ورنہ خدا تعالیٰ نے چاہے تو اچھا بھلا انسان بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر کمانے سے معذور ہو جائے۔ لہذا کمانے والوں کا فرض ہے کہ وہ محروم رہنے والوں کی دستگیری کریں اور انہیں سہارا دیں۔

دراصل اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے کہ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا صرف اسی کو حق حاصل ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے بلکہ اسلام کے نقطہ نظر سے کمزوروں کو سہارا دینا اور زندگی کی دوڑ میں ان کی اعانت کرنا مضبوط و طاقتور افراد کا فریضہ ہے، اسی طرح معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کو سہارا دینا اہل دولت کی ذمہ داری ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا اور گرے ہوئے کو کچل کر گذر جانا سنگدلی اور درندگی ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر گرتوں کو تھاما نہ جائے اور ناداروں کو سہارا نہ دیا جائے تو معاشرہ انسانی قدروں سے خالی ہو جاتا ہے اور انسانی معاشرہ کہلانے کا حقدار نہیں رہتا۔

اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعے معیشت کو مستحکم کرتا ہے اور معاشرے کو باہمی تعاون و ہمدردی کی فضا پیدا کر کے صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اسلام ایک فلاحی مملکت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور زکوٰۃ کے ذریعے کمزور و بے سہارا اور مجبور و حاجتمند افراد کی ضروریات زندگی کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے۔ اسلام کا بنیادی

مقصد یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد بھی خواہ وہ اپاہج و معذور، یتیم و لاوارث اور ضعیف و محتاج ہی کیوں نہ ہو بے روزگاری اور غربت و افلاس کا شکار نہ ہو جائے بلکہ بیت المال کے زکوٰۃ فنڈ سے اسے ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں تاکہ پورا معاشرہ خوشحال رہے۔

نظامِ زکوٰۃ کو مسلمانوں نے عملاً نافذ کر کے دکھایا کہ فلاحی مملکت کے قیام کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ بلکہ ناگزیر ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت نے آبادی کی مردم شماری کرائی، معذوروں اور مجبوروں کے رجسٹر تیار کرائے اور زکوٰۃ فنڈ سے ان کے وظائف مقرر کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ زکوٰۃ دینے والے تو سینکڑوں تھے مگر لینے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اکثر مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بالکل یہی کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ زکوٰۃ لینے والا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

اس کے علاوہ زکوٰۃ معاشی ناہمواری دور کرنے اور دولت کی غیر فطری تقسیم کو ختم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے پاتی بلکہ امیروں سے غریبوں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس طرح افراد معاشرہ میں باہمی ہمدردی و تعاون پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی مساوات و ہم آہنگی بھی قائم رہتی ہے۔ پھر عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے اور پیداواری عمل بھی تیز ہو جاتا ہے۔ اس طرح ملکی و قومی معیشت میں توازن قائم رہتا ہے اور معاشی بحران کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ صدقاتِ واجبہ اسلام نے ارتکازِ دولت کو مزید روکنے کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ ایسے صدقات بھی مقرر کئے ہیں جو مختلف مواقع پر صاحب حیثیت مسلمان پر ادا کرنا واجب ہوتے ہیں۔ مثلاً صدقہ فطر، عید الاضحیٰ کی قربانی، نذر وغیرہ۔ ان کے مصارف و فوائد بھی زکوٰۃ ہی کی طرح ہیں۔

۴۔ **انفاق فی سبیل اللہ** ارتکاز دولت کا سدِ باب کرنے کے لئے اسلام واجب صدقات کے علاوہ نفلی صدقہ کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ جسے "انفاق فی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں خرچ کہا گیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان میں مال کی محبت کم ہو اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کا جذبہ فروغ پائے تاکہ پورا معاشرہ خوشحال ہو۔ اس لئے قرآن و سنت میں انفاق فی سبیل اللہ کی بار بار تاکید ہوئی ہے۔ اور اسکے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲۷۴)

جو لوگ (اللہ کی راہ میں) اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات کو اور دن کو پوشیدہ اور ظاہر پس ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے۔ اور نہ انہیں کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ارتکاز دولت کو ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام کا سب سے بڑا اقدام اس کا قانون وراثت ہے۔ اسلامی قانون وراثت کی رو سے فوت ہونے والے کی جائیداد و مال صرف ایک یا دو ہاتھوں میں منتقل نہیں ہوتا بلکہ پورے خاندان میں ایک فطری ترتیب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اسطرح دولت کی ایک منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے اور دولت کبھی بھی کسی ایک ہاتھ میں مرتکز نہیں ہو پاتی۔

۵۔ **حق سوی الزکوٰۃ** زکوٰۃ اور صدقات واجبہ تو قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی ادائیگی لازم ہے مگر ایک دولت مند شخص صرف یہی ادا کر کے ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو جاتا بلکہ اگر ان سے معاشرہ کے نادار اور محتاج افراد کی کفایت نہ ہو سکے تو حکومت استحکام ریاست اور

عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اس سے مزید رقم بھی وصول کرسکتی ہے جسے "حق سوی الزکوٰۃ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکوٰۃ (ترمذی شریف) — بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے۔

۶:- **عفو** اسلام نے صرف زکوٰۃ - صدقاتِ واجبہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہی سے ارتکازِ دولت کا سدباب نہیں کیا بلکہ "عفو" کی ترغیب دے کر یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ انسان صرف ضرورت کے مطابق دولت اپنے پاس رکھے اور اس سے زائد جس قدر ہو اللہ کی راہ میں دوسروں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا رہے۔ اسی کا نام "عفو" ہے چنانچہ قرآن پاک نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۠ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرۃ: ۲۱۹) — (اے نبیؐ) لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپؐ کہدیجئے کہ جو کچھ بچ رہے۔

ان مختلف اقدامات سے اسلام ارتکازِ دولت کو روکتا ہے اور دولت کی منصفانہ و مساویانہ تقسیم عمل میں لاتا ہے تاکہ دولت معاشرے کے ہر فرد تک پہنچے اور معاشرہ خوشحال ہو۔

سوال ۱:- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں "انفرادی ملکیت و تصرف" پر نوٹ قلمبند کیجئے۔

جواب:- اسلامی تصور ملکیت کی رو سے تمام کائنات کا مالک حقیقی فقط خدا تعالےٰ ہے لیکن ضروریاتِ زندگی کے لئے اس نے انسان کو محدود انفرادی ملکیت و تصرف کا حق دیا ہے۔ جو چیز انسان جائز طریق پر حاصل کرتا ہے اس پر اسے ملکیت

ہوتی ہے اور اسے جائز طور پر صرف کرنے کا اسے پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ حکومت یا مملکت یا اس کے کسی ادارے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کی اس جائز ملکیت و تصرف میں دخل اندازی کرے۔ لیکن اگر کسی کی ملکیت ظلم و تعدی کا نتیجہ ہو یا ظلم و ستم کا ذریعہ بنے یا دوسروں کے حقوق پر اثر انداز ہو تو حکومت کو مداخلت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح اگر تصرف بھی ناجائز جگہ پہ ہو رہا ہو تو حکومت اسے روک سکتی ہے۔

اسلام کا انفرادی ملکیت و تصرف کے بارے میں یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس سے معاشی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے اور عمدہ اخلاق پروان چڑھتے ہیں۔ دراصل اسلام انفرادی ملکیت کو ایک امانت کی صورت دیتا ہے۔ اسی لئے یہ ملکیت محدود ہے اور اس میں تصرف کا حق بھی بعض قانونی و اخلاقی پابندیوں سے محدود ہے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ انسان تمام وسائل حیات کو اپنی مستقل ملکیت سمجھ کر بندگانِ خدا کی ضروریات سے غافل نہ ہو جائے بلکہ عارضی امانت سمجھ کر اس میں سے خدا کے ضرورت مندوں اور حاجتمندوں پر خرچ کرتا رہے۔ تاکہ معاشرہ خوشحال و فارغ البال رہے۔

سوال ۸۲:۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عدل اجتماعی کا مفہوم اور اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

جواب:۔ عدل اجتماعی سے مراد یہ ہے کہ حکومت یا ریاست اپنی تمام رعایا کو بنیادی ضروریات زندگی لازماً فراہم کرے۔ ریاست کے دولت مند اور خوشحال لوگ معذوروں اور ناداروں اور ضرورت مندوں کی امداد کریں۔ مزدوروں کسانوں اور دوسرے کارکنوں کو عدل و انصاف حاصل ہو اور اسطرح ہر ایک کو معاشی تحفظ بہم پہنچایا جائے اور کسی قسم کا ظلم نہ ہونے دیا جائے۔

اسلام سماجی فلاح اور معاشی عدل کے قیام کو ریاست کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ اور زکوٰۃ و صدقات کے نظام سے رعایا کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتا ہے۔ پھر معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعے اجتماعی عدل کو قائم کرتا ہے اسلامی حکومت اپنی حدود میں بسنے والے ہر انسان کو بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانا اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ اور بیمار ضعیف۔ بے روزگار۔ لاوارث۔ یتیم۔ بیوہ اور معذور ہر ایک کو ہر طرح کا جانی و مالی تحفظ مہیا کرتی ہے۔

اسلام نے سماجی فلاح اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس سے کوئی شخص بھی بے یار و مددگار نہیں رہ سکتا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر کسی شخص کا کوئی بھی بار اٹھانے والا نہ ہو اور کوئی بھی اس کی سرپرستی نہ کر رہا ہو تو حکومت اس کی سرپرست و ولی ہوتی ہے اور اس کی تمام ضروریات حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ۔ (بخاری شریف)

جس کا کوئی ولی نہیں حکومت اس کی ولی (سرپرست) ہے۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا۔

مَنْ تَرَكَ كَلًّا فَاِلَیْنَا۔ (بخاری و مسلم)

جس نے ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ (قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا وہ ہمارے (حکومت کے) ذمہ ہے۔

آپؐ نے اجتماعی عدل کے قیام کی خاطر فرمایا کہ اے لوگو! صدقہ دو کیونکہ تم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی صدقہ لے کر پھرے گا مگر کوئی لینے والا اسے نہ ملے گا۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اجتماعی عدل کے قیام کا تہیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بخدا اگر میں زندہ رہا تو صنعا کی پہاڑیوں میں بیٹھا ہوا چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے

اسکو اس کے مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اسکے لئے اسے خود کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی؟" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "مجھے اگر عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لئے زندہ رہا تو ان کو اسی حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد وہ کسی کی مدد کی محتاج نہ رہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ نے اسی بات کو یوں بیان فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے دولتمندوں کے اموال میں غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات مقرر کردی ہیں۔ پس اگر وہ ان کا حق ادا نہ کریں اور یہ ان کی عدم توجہی سے بھوکے ننگے اور تنگدست ہوں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان سے محاسبہ کرے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت صحیح معنوں میں عدل اجتماعی اور سماجی فلاح و بہبود کا مکمل طور پر ضامن ہے اور خلافت راشدہ کا دور دنیا کے سامنے اس کی زندہ مثال ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

سوال ۴۳:۔ ریاست کی تعریف کیجئے اور اسکی ضرورت و اہمیت واضح کیجئے۔

جواب:۔ انسان نے اپنی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے جو ادارے قائم کئے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ریاست اس منظم ادارے کا نام ہے جو کسی ملک کا نظم و نسق چلانے اور قائم رکھنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ قیام ریاست کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ (۱) اقتدار (۲) اطاعت۔

ریاست کا ناظم اعلیٰ اقتدار پر قابض ہوتا ہے۔ اور اسکے باشندے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اطاعت و اقتدار کے اجتماع سے ریاست معرض وجود

میں آتی ہے۔ داخلی و خارجی انتظامات کے لئے ریاست کا قیام ناگزیر ہے۔ قیام ریاست کے بغیر نہ ملکی حدود کا تحفظ ممکن ہے۔ نہ داخلی انتشار و خلفشار کو روکا جا سکتا ہے۔ ہر شہری کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح اس کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ ریاست کے بغیر نہ حقوق کی حفاظت و نگہداشت کی کوئی صورت ہے نہ فرائض کی عدم ادائیگی پر زجر و عتاب کا کوئی امکان ہے۔ ظہور اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب کی یہی حالت تھی۔ منظم حکومت نہ ہونے کے باعث ہر طرف غنڈہ گردی اور شر و فساد کا دور دورہ تھا۔ غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ نہ مظلوم کسی کے آگے داستان ظلم و ستم بیان کر کے داد خواہی کا امیدوار ہوتا نہ ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کوئی قوت حرکت میں آتی۔

انسان جب دوسروں سے لین دین کرتا ہے تو ان معاملات کی انجام دہی کیلئے اسے قانون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ قانون کے پہلو بہ پہلو اسے ایسے ادارہ کی ضرورت اولین مرحلہ پر محسوس ہوتی ہے جو اپنی قوت اقتدار سے اس قانون کو نافذ کرے۔ قوتِ نافذہ کی عدم موجودگی میں قانون بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات لین دین اور تمدنی معاملات کی ترتیب و تہذیب کا محافظ ہے۔ فرد اپنی صلاحیتوں کو اسی صورت میں بروئے کار لا سکتا ہے اور اسکی ذہنی نشو و نما اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک طرف اسے سازگار اور پر امن ماحول حاصل ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود نہیں حاصل کر سکتا۔ قیام ریاست کے بغیر نہ دفاع ممکن ہے نہ عدل و انصاف اور تحصیل علم کا کوئی ذریعہ موجود ہے۔ اسی بناء پر ریاست کے قیام سے انسانی زندگی کی تشکیل میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ریاست کی اسی ضرورت و اہمیت کا تقاضا ہے کہ انسان نے جب سے

اپنے تہذیبی سفر کا آغاز کیا ہے۔ وہ اسی وقت سے اس ادارہ کی بے پناہ افادیت کا قائل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ گویا ریاست کے تدریجی ارتقاء اسکے استحکام اور اس کے مختلف ادوار و منازل کی تاریخ ہے۔ انسان نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں ریاست کو بڑھانے اور پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ دور حاضر میں اجتماعی ترقی اور زندگی کے احوال و کوائف کی تبدیلی کے باعث یہ ادارہ برابر ترقی کی منزلیں طے کر رہا اور اسکے اثر و رسوخ اور وسائل و ذرائع میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ریاست کا کام صرف ملکی دفاع اور قیام امن و امان تک ہی محدود نہیں بلکہ اسکے ذریعہ اجتماعی عدل و انصاف اور سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی زبردست مدد ملتی ہے۔

یہ ادارہ اسقدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسکی گرفت سے باہر نہیں اور یہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر برابر اثر ڈالتا ہے۔ ریاست کا قیام و بقاء اور ارتقاء اخلاقی اقدار اور انسان کے جذبۂ عدل و انصاف کا رہین منت ہے۔ اگر دنیا میں عدل و انصاف کی کارفرمائی نہ ہوتی تو ریاست کا ادارہ عالم وجود میں نہ آتا۔ عدل و انصاف محور و مرکز ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر ذرہ حرکت کرتا ہے۔ ریاست کے سب افعال و امور صرف عدل و انصاف ہی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ریاست اگر معاشی تعلقات استوار کرتی ہے تو عدل کے لئے، اگر قانون بناتی ہے تو اس کی غرض بھی قیام عدل ہوتی ہے اور بس۔ ریاست پر اخلاقی احساس کا اسقدر غلبہ ہوتا ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھی کچھ قوانین مرتب کرتے ہیں تو عوام میں ان کو مقبول بنانے کے لئے مجبوراً اس پر عدل و اخلاق کی ملمع سازی کرتے ہیں۔

تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی ریاست نے کوئی غیر اخلاقی قانون بنایا اور عوام نے اسے شرف قبول نہ بخشا تو زود یا بدیر ایسا زبردست انقلاب

برپا ہوا جس نے ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ریاست کو ہمیشہ استحکام اسی صورت میں حاصل ہوا جب اسکے قوانین قومی انداق اور قلب و ضمیر سے ہم رنگ و ہم آہنگ تھے اور قوم ان کو چاہتی تھی۔

سوال ۸۴:۔ آئین۔ قانون اور دین میں کیا تعلق ہے؟ نیز بتائیے کہ اقامتِ دین کے لئے قانون و اقتدار کی کس حد تک ضرورت ہے؟

جواب:۔ دین اسلام اس جاہلانہ تصور کا قائل نہیں کہ دین اور دنیا دو چیزیں ہیں۔ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خارج نہیں ہے۔ اسلام اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور عمرانی تمام قسم کے مسائل کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ ریاست کا اولین مقصد عدل و انصاف کا قیام و بقا ہے یہ دین کا کام ہے کہ وہ ریاست کے لئے اصول۔ انصاف اور ضابطۂ اخلاق مہیا کرے جس کو ریاست قائم کرنے کے دریے ہو۔ قرآن ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم پوری زندگی کو مسلمان بنائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی کے کچھ حصے آغوش اسلام میں آجائیں۔ اور اسکے کچھ اجزاء اسلام کی حدود سے باہر رہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً	اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

(البقرۃ۔ ۲۰۸)

اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ ہمارا اسلام ناقص نہ ہو۔ اگر ہم اسلام لاتے ہی ہیں تو پوری زندگی کو اسلام کا مطیع کر دیں اور اسکے تمام گوشوں میں اسلامی اصول و ہدایات کو جاری کر دیں۔

اہل کتاب کی یہ عادت تھی کہ جو احکام خداوندی ان کے موافق ہوتے ان پر

عمل پیرا ہوتے اور جو طبیعت پر گراں ہوتے انہیں نظر انداز کر دیتے گویا شریعت کا انحصار ان کی پسند پر تھا۔ اللہ تعالٰی نے ان الفاظ میں ان کو ڈانٹا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (البقرۃ۔ ۸۵)	کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔

پھر اس جرم کی سزا ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرۃ۔ ۸۵)	پس اگر تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و رسوائی کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا

قرآن کریم کے ان واضح احکام کے بعد دین اسلام کی ناقص اطاعت خارج از بحث معلوم ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیاء کرام کا شیوہ بھی یہی رہا کہ وہ برسر اقتدار لوگوں کو ہمیشہ دین حق کی طرف بلاتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ قوت و اقتدار کو صرف خدا کی ذات میں محدود کرنا اور شرک کا قلع قمع کرنا تھا خواہ وہ کسی شکل و صورت اور زمان و مکان میں موجود ہو۔ حضرات انبیاء کی مشترکہ دعوت آغاز انسانیت سے یہی رہی ہے کہ

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ۔ (الاعراف۔ ۶۵)	اے میری قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (سورہ یوسف ۴۰)	قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کیلئے نہیں۔
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الاعراف ۵۴)	خبردار تخلیق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لئے ہے۔
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (الشعراء ۱۴۴)	اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

انبیائے کرام نے انسان کی پوری زندگی کو اپنی دعوت وارشادات کا نشانہ بنایا اور اس بات کے لئے معروف سعی وجہد ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری وساری رہے۔ انہوں نے ریاست کی اصلاح وفلاح کے لئے بھی انتہائی کوشش کی۔ قرآن کریم کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی مظلومی کا مرقع تھی۔ لیکن مدینہ میں اسلام کی اقتصادی وسیاسی قوت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ ۲ھ میں غزوہ بدر کی شاندار فتح نے مسلمانوں کے لئے قوت وشوکت کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن ماہ رمضان ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا جس نے کفار قریش کے تابوت میں آخری کیل لگا دی اور ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب فاتحانہ شان سے مدینہ لوٹے تو اسلامی حکومت کی تشکیل نو کر ڈالی۔ آپ نے تاسیس حکومت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ کیا کہ قبائل میں تحصیلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا لیکن دراصل خلافت الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ حجۃ الوداع کے زمانہ تک تکمیل پذیر ہوئے۔ چونکہ آپؐ کا اصل مقصد دعوت اسلام۔ اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفوس تھا اس لئے آپ نے ملکی انتظامات اسی حد تک قائم کئے جہاں ملکی بدامنی کے باعث دعوت توحید میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔

فکرِ اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۸۰)

اور آپ کہہ دیں کہ اے پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تھوڑا عرصہ پہلے نازل ہوئی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت میں دعا کرتے ہیں کہ یا تو مجھے خود اقتدار سے بہرہ ور کر یا کسی حکومت کو میرا پشت پناہ بنا دے تاکہ تیری عطا کردہ قوت و شوکت سے میں دنیا میں پیدا شدہ فتنہ و فساد کی اصلاح کر سکوں، برائیوں کا انسداد کر دوں، نیکیوں کو قائم کر دوں اور تیرے قانونِ عدل کا سکہ دنیا میں جاری کر دوں۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے اور ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی یہی تفسیری مسلک اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں۔

آپ نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَالَا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے حکومت کے ذریعہ ان چیزوں کو روک دیتا ہے جن کا انسداد قرآن سے نہیں کرتا۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چند سعادت مند انسان ہی ایسے ہوتے

ہیں۔ جو قرآنی مواعظ و نصائح کو سن کر ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن جب شرعی احکام کو قانون کی پشت پناہی حاصل ہو جائے تو کوئی شخص سرتابی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ایک دوسری حدیث میں تاجدارِ مدینہ علیہ السلام نے یوں فرمایا۔

اَلْاِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ تَوْأَمَانِ لَا یَصْلُحُ وَاحِدٌ مِنْهُمَا اِلَّا بِصَاحِبِهٖ وَالْاِسْلَامُ اُسٌّ وَالسُّلْطَانُ حَارِسٌ وَمَا لَا اُسَّ لَهٗ یَنْهَدِمُ وَمَا لَا حَارِسَ لَهٗ ضَائِعٌ۔ (کنزالعمال)

اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کی درستی دوسرے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسلام ایک عمارت ہے اور حکومت اس کی نگران ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ ضرور گر جائے گی۔ اور جس کا کوئی پاسبان نہ ہو وہ ضائع ہو جائے گا۔

مزید براں یہ بات قابل غور ہے کہ حکومت کے بغیر اسلامی احکام کو نافذ کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے اس لیے وہ جمیع شعبہ ہائے حیات کے لئے قوانین دیتا ہے۔ مثلاً اسلام کا اپنا قانون شہادت ہے، فوجداری اور دیوانی قانون ہے، تجارت اور کاروباری معاملات کے لئے اس کے پاس ایک مفصل قانون موجود ہے۔ اس کے پاس نکاح و طلاق، وراثت و وصیت اور بیع و شرا کے قوانین موجود ہیں۔ ان سب قوانین کو نافذ کرنے کے لیے حکومت کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت موجود نہ ہو تو شریعت کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے حکومت دریاست سے چارہ نہیں۔ اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام اور حکومت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی دوسر

کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

سوال ۸۵ :۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد حکومت الٰہیہ کی تشکیل تھا۔

جواب :۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا اور دنیا میں خداوندی نظام حکومت اور اسلامی اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ امر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی تمام مساعی بے کار ہیں۔ اس قسم کی کوششوں کے نتیجہ میں صرف چند آدمیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اس سے کسی قوم کی اصلاح و فلاح کی امیدیں وابستہ کرنا کسی طرح درست نہیں جبکہ ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عالمگیر انقلاب کے ذریعہ پوری فضا کو بدل دیا جائے اور پورے معاشرہ کی کایا پلٹ جائے۔ یہی طریق کار تھا جس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا۔ تجربہ و مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ کوئی انقلاب اس سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوا۔ مستقبل میں بھی یہی طریق کار اسلام کی ترقی کا ضامن اور اس کی اصلاح و فلاح کا کفیل ہے۔

اسلام عالمگیر اصلاح کا داعی ہے اور اس کا مقصد صرف چند آدمیوں کو دعوت دینا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی طرح اسلام چند عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے لئے ایک مکمل نظام عمل ہے۔ اس لئے وہ پوری کائنات کا طرز و انداز، افتاد مزاج اور رنگ ڈھنگ مکمل طور پر بدل دینا چاہتا ہے، اسلام

اس بات کا متقاضی ہے کہ نہ صرف افکار و آراء بلکہ اخلاق و معاشرت زندگی کے معیار و مدار، طرز فکر و نظر اور انسانی توازن کو بھی اپنے سانچہ میں ڈھال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام حکومت کو قائم کئے بغیر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ اقتدار پر اسلام کا قبضہ ہو، قانون سازی کا حق اسلام کے سوا اور کسی کے پاس نہ ہو۔ وہ خود ہی قانون بنائے اور خود ہی چلائے۔ اس کے نمائندے اپنے طرز عمل بے مثال سیرت و کردار اور اعلیٰ اخلاق سے یہ ثابت کر دیں کہ یہی دین اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ اسلام کے مادی اقتدار کا نتیجہ یقیناً اس کے روحانی اقتدار کی صورت میں برآمد ہو گا۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (سورۃ الحج - ۴۱)	مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حصول اقتدار، قیام صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، نیکیوں کے پھلنے پھولنے اور خواہش و منکرات کے انسداد کا موجب ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک ایسا اہم فریضہ ہے کہ اسے امت مسلمہ کا مقصد وجود اور علت ظہور قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے معرض ظہور میں لائی گئی ہے

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران ۱۱۰) — تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

امر بالمعروف ایک ایسا فریضہ ہے جس کی بجا آوری قیامت کے دن تک مسلمانوں پر فرض ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (سورۂ آل عمران ۱۰۴) — اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی دعوت دے۔ بھلائی کا حکم دے اور برائی سے باز رکھے۔

اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امر و نہی کے لیے سیاسی قوت و اقتدار کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ نیک کام کرنے کی التجا کریں گے یا منت سماجت کے ذریعہ برائی سے روکیں گے۔ لہٰذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اسی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے جب قوت و اقتدار کی باگ ڈور اہل اسلام کے ہاتھ میں ہو۔ سیاسی اقتدار کے بغیر اس فریضہ کی ادائیگی کا کوئی امکان نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ" — تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسکو ہاتھ سے بدل دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ برائی کا ہاتھ سے روکنا اعلیٰ ترین ایمان کی علامت ہے۔ زبان سے روکنا درمیانہ درجہ ہے اور دل سے برا سمجھنا ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہاتھ سے روکنا اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی اس کی

قدرت رکھتا ہو اور قدرت کے لئے قوت وشوکت کی ضرورت ہے۔ برائی کو زبان سے روکنے کے لئے کسی حد تک قدرت مطلوب ہے۔ دونوں کی عدم موجودگی میں تیسرے درجہ پر اکتفا کرنا ہوگا جو ایمان کا آخری درجہ ہے۔ آجکل تو یہ تیسرے درجہ کا ایمان بھی عنقا ہے۔ دورِ حاضر میں برائی کا ارتکاب کرنے سے پہلے اس کی حلّت کا فتویٰ بھی صادر کر دیا جاتا ہے۔ جب سود کو نفع اور رشوت کو ہدیہ کا نام دے کر حلال طیّب قرار دے لیا جائے تو حرام کونسی چیز رہی؟ غلامانہ ذہنیت نے ہماری سیرت وکردار کے ساتھ ساتھ ہمارے قلب وذہن کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ بُرائی کا احساس مرچکا ہے۔ ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (اقبالؒ)

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ فطرتِ اسلام اور نصوصِ کتاب وسنت اس امر کے متقاضی ہیں کہ اسلام کی نشر واشاعت اور سربلندی کے لئے ایک آزاد ماحول ہونا چاہیئے جس میں دینی حدود کے اندر رہ کر حکومت و ریاست کے وسائل کو اسلام کے فروغ کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو ریاست اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مصروفِ سعی وجہد ہوگی وہ اسلامی ریاست ہے۔ اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔ پاکستان بھی اسی لئے معرضِ وجود میں آیا تھا کہ مسلمان یہاں اپنے افکار وعقائد اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گذار سکیں گے۔ ورنہ اسلامی عبادات وارکان ادا کرنیکی اجازت تو انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی حاصل تھی۔

سوال نمبر ۸۶:۔ اسلام میں امامت وخلافت کی حیثیت پر ایک جامع نوٹ لکھیے

جواب:۔ اسلام کا نظریۂ امامت وخلافت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالےٰ نے

دنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر بھیجا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو احکام خداوندی کی اطاعت کرے اور اپنے افروز سوز غ سے کام لے کر ان کو دنیا میں نافذ کرے۔ انسان کی غایت تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ — میں نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

عبادت کا اطلاق بندگی اور اطاعت دونوں پر ہوتا ہے۔ آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان دنیا میں خداوند تعالیٰ کی عبادت و اطاعت دونوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان طبعاً یہ کام انجام دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے مختلف وجوہ و اسباب ہیں۔

۱۔ انسان طبعاً تغافل شعار واقع ہوا ہے۔

۲۔ دنیوی حرص و ہوا عبادت خداوندی سے مانع ہے۔

۳۔ انسان مشاغل حیات میں منہمک ہو کر عبادت خداوندی بجالانے سے قاصر رہتا ہے۔

ان امور و اسباب کا تقاضا ہے کہ کوئی بالائی قوت ہونی چاہیے جو انسان سے اوامر خداوندی کی تعمیل کرائے اور اسے باغی ہونے سے بچائے۔ یہ اختیار اسی انسان کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے اس کا اہل ہوتا ہے۔ اس کو امیر، خلیفہ یا امام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں :-

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ — خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح کہ گذشتہ امتوں کو اس نے

الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا" (سورۂ نور)

اپنی خلافت عطا کی تھی۔ اور ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی کو امن سے بدل دے گا۔

یہ آیت کریمہ اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ کہ خدا کی اس امانت (امامت وخلافت) کا بار انہی لوگوں پہ ڈالا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل ہوتے ہیں

۱۔ وہ ایماندار ہوں۔

۲۔ اعمال صالح انجام دیتے ہوں۔

۳۔ خدا کی عبادت کرتے ہوں۔

۴۔ شرک سے بیزار ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو قوم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام پر عمل نہیں کرتی خواہ وہ کس قدر طاقتور با اقتدار اور زور آور ہو وہ خلافت الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکمیت مطلقہ، صرف خدا کی ذات کیلئے ہے۔ دنیا میں جو حاکم ہوگا وہ صرف خدا کا خلیفہ (نائب) ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مومن خلیفہ بننے کے مستحق ہیں اور جو خلافت ان کو ملے گی وہ عمومی حیثیت کی ہوگی کسی ایک شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ میں محدود نہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر ہر مومن خدا کا خلیفہ ہے۔ اور اس حیثیت سے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

مدینہ منورہ تشریف لاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الٰہیہ کی تشکیل فرمائی آپؐ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو یہ عظیم امانت سونپی گئی۔ خلافت راشدہ صحیح معنوں میں حکومت الٰہیہ اور نیابت نبوت تھی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا

کہ خلفائے راشدین مومن مخلص، عبادت گزار اور نیکوکار تھے۔ انہی صفات کی بناء پر اس عظیم امانت کیلئے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

اسلامی حکومت انسانی ذہن کے اختراع کردہ قوانین کی مرہون منت نہیں ہوتی نہ اسے انسانی قواعد و ضوابط کا احتیاج ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک بنا بنایا، دستور ہوتا ہے جو اس خطۂ ارضی پر بسنے والے تمام بنی نوع انسان کی ضرورت کا کفیل ہے۔ یہ دستور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ یہ ازلی اور ابدی ہے۔ انسانی تمدن بدلتا رہتا ہے۔ انسانی ذہن کے سانچے نئے نئے قالب اختیار کرتے ہیں۔ ہر ملک و ہر قوم کے جذبات و احساسات طرزِ بود و باش اور طرزِ فکر و نظر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مگر خداوندی قانون کبھی نہیں بدلتا۔ اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ دستور اس قانون سازِ حقیقی کا وضع کردہ ہے جو علیم و خبیر اور علام الغیوب ہے۔ اسے انسانی ضروریات کا بخوبی علم ہے اس کا وضع کردہ قانون ان کے بالکل مطابق ہے۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ صرف احکام کو نافذ کرتا ہے وضع نہیں کرتا۔ اس لئے اقتدارِ اعلیٰ قانون سازِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے

"اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" حکم صرف خدا کا ہے۔

اس آیت سے خلیفہ و امیر کے حدودِ اختیار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا جو اللہ و رسول نے نہ دیا ہو۔ اگر وہ ایسا حکم دے گا تو وہ قابلِ اطاعت نہیں۔ گویا اصل اطاعت اللہ کی ہے امیر کی نہیں۔ امیر اس لئے واجب الاطاعت ہے کہ وہ خدا کے احکام دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اطاعتِ امیر پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں سے صاحب

الامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی بات میں حاکمِ وقت سے تمہارا اختلاف ہو تو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کی شرط یہ ہے کہ اس بات میں اللہ اور رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی طریقہ اچھا ہے۔"

(سورۃ نسا۔ رکوع ۸)

اس آیت میں اطاعتِ امیر کا حکم دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ "مِنْکُمْ" (مسلمانوں میں سے) کی شرط کا حامل ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت وہ ہے جو انسانی قانون کے بجائے خداوندی قوانین پر عمل پیرا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جس حکومت و ریاست میں مسلمان بود و باش رکھتے ہوں اور ان کا حاکم بھی مسلمان ہو اس ریاست کو بھی اسلامی کہا جاتا ہے۔ اسے مسلم سٹیٹ یا مسلم حکومت تو کہا جا سکتا ہے مگر اسلامی حکومت کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔

خلیفہ کا انتخاب | خلافت کا حق پوری ملت کو عطا ہوتا ہے۔ اس ملت کے سب افراد نظم و نسق میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ افرادِ ملت میں سے چند دیندار اور اہل آدمیوں کا انتخاب کرکے ایک مجلسِ شوریٰ مرتب کی جاتی ہے۔ یہی مجلسِ شوریٰ خلیفہ کا انتخاب کرتی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ" (وہ اپنے معاملات مشورہ سے طے کرتے ہیں)

مجلسِ شوریٰ کے تمام ممبر قابل، دیانت دار اور ہر لحاظ سے اس کے اہل ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلسِ شوریٰ کا انتخاب شرط نہیں۔ البتہ ملتِ اسلامیہ کی رضامندی اور عام پسندیدگی ضروری ہے۔

نصبِ امامت کا وجوب | یہ ایک فقہی مسئلہ ہے جس پر تمام مکتبہ ہائے فقہ کا اتفاق ہے کہ ملت کے لئے نصبِ امامت ضروری ہے اور امام کا تقرر واجب ہے اس لئے کہ امام کی عدم موجودگی میں ملت کا نظم و نسق، ملکی امن و امان، دفاع اعداء اور احکام شریعت کا انفاذ و اجرا ممکن نہیں۔ امام ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں۔

"اِتَّفَقَ جَمِیْعُ اَھْلِ السُّنَّۃِ وَجَمِیْعُ الْمُرْجِئَۃِ وَجَمِیْعُ الشِّیْعَۃِ وَجَمِیْعُ الْخَوَارِجِ عَلٰی وُجُوْبِ الْاِمَامَۃِ وَاَنَّ الْاُمَّۃَ وَاجِبٌ عَلَیْھَا الْاِنْقِیَادُ لِاِمَامٍ عَادِلٍ یُقِیْمُ اَحْکَامَ اللّٰہِ وَیَسُوْسُھُمْ بِاَحْکَامِ الشَّرِیْعَۃِ الَّتِیْ اَتٰی بِھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" (الفصل بین الملل والنحل لابن حزم جلد چہارم ص۸۷)

سب اہل سنت مرجیہ شیعہ اور خوارج اس بات پر متفق ہیں کہ امام کا تقرر واجب ہے۔ نیز یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے" (ازالۃ الخفاء مقصد اول فصل اول)

اس سے معلوم ہوا کہ نصب امامت کا مسئلہ اجماعی ہے جس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ اختلاف اگر ہے تو وہ تقرر امام کی تفصیلات وجزئیات یا اس کے طرق وشرائط میں ہے۔ لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں یہ سب کے نزدیک ضروری ہے۔

تلخیص مباحث سابقہ | نصب امامت کے باب میں بیان کردہ مباحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ حکومت کا قیام انسانی معاشرہ کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے اور اس نے انفرادی واجتماعی زندگی کیلئے

ہدایات دی ہیں۔

۳۔ اسلام کی نگاہ میں دین و سیاست کی کوئی تفریق نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خداوندی قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس لئے سیاست کو بھی اسلامی سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اسلام دینی احکام کے نفاذ و اجراء میں ریاست سے مدد لیتا ہے۔

۴۔ یہ امر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ کہ دینی احکام کی ادھوری اطاعت کی جائے بعض احکام پر عمل کیا جائے اور بعض سے روگردانی اختیار کی جائے۔

۵۔ اسلام اور حکومت باہم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ اگر حکومت و ریاست سے دین کو خارج کر دیں تو فرعونیت اور چنگیزی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کی ناقص تعمیل ہو گی۔ لوگ جس حصہ پر چاہیں گے عمل کریں گے اور جس کو چاہیں گے نظر انداز کر دیں گے۔ اس لئے ریاست کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے اور حکومت کے لئے اسلام کی پابندی ناگزیر ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

اصولی اور نظریاتی ریاست

سوال نمبر ۲۔ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ اسلامی ریاست اصولی اور نظریاتی ریاست ہے؟ نیز اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق حکومت کے مقاصد و غایات کیا ہیں؟

جواب:۔ جو چیز ایک اسلامی ریاست کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے

دوسرے یہ کہ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی بنیاد نہ رنگ و نسل پر ہے اور نہ وطن و زبان پر۔ یہ معاشی مفادات کے اشتراک اور سیاسی گٹھ جوڑ پر بھی مبنی نہیں ہے۔ اس ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی داعی اور اس کی پیروی کرنے والی اور اس کو دنیا میں چلانے اور پھیلانے والی ہے۔ اسلامی ریاست حاکمیتِ اعلیٰ کا منصب صرف اللہ تعالیٰ کو تفویض کرتی ہے۔ حاکم اور امیر قانون کا بنانے والا نہیں ہوتا بلکہ ایک بنے بنائے خداوندی قانون کو چلانے والا ہوتا ہے۔

باقی ریاستوں کی طرح اسلامی ریاست کا بھی ایک متعین علاقہ اور حدودِ اربعہ ہوتا ہے جس کی حفاظت و نگہداشت اور جس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ تاہم اسلامی حکومت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے جس کے اصول و ضوابط کسی خطۂ ارضی تک محدود و محصور نہیں بلکہ وہ یکساں طور پر پوری انسانیت کے لئے ہیں۔

اسلامی ریاست کے مقاصد اسلامی حکومت کا اولین مقصد اسلامی ارکان و عبادات کا قیام، نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو مٹانا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" (الحج۔ ۴۱)

مسلمان — ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین کا اقتدار سونپ دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں گے اور نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے

دوسری جگہ فرمایا:

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور

فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ بِالْغَيْبِ" (الحدید ۔ ۲۵)

ہم نے لوہا (یعنی ریاست کی قوت و شوکت) اتارا جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کیلئے بہت فوائد بھی ہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ کون اسکی اور اسکے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے

اس آیت میں میزان کے لفظ سے اسلام کے متوازن اور مبنی بر عدل و انصاف احکام مراد ہیں جن کے وسیلے سے لوگوں میں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ الحدید (لوہا) سے احکام جہاد اور حدود و تعزیرات مراد ہیں۔ اس آیت میں حکومت حاصل کرنے کا مقصد یہ بتایا کہ خدا کے دین کو قائم کیا جائے اور اس کے رسولوں پر نازل شدہ شریعت کو دنیا میں عملاً نافذ کیا جائے:

ایک اور جگہ فرمایا:

• وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ. وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کو ان کے لئے قوت دیگا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے۔ اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کریں گے اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں اور اے مسلمانو! نماز

ترجمہ: "قائم کرو اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو
(سورۃ نور۔ ۵۵۔۵۶) اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق عدل و انصاف کرنا، نیکیوں کا پھیلانا اور برائیوں کا مٹانا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے۔ اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سربلندی ہے جسے قائم کرنے کے لئے وہ قائم کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں ریاست و حکومت کا ادارہ کن اعلیٰ مقاصد کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے پیش نظر کونسے بلند نظریات ہیں۔

سوال نمبر ۹۹:۔ اسلامی ریاست میں اقتدار کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے؟ مدلل طور پر بیان کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہی قانون ساز اور دستور ساز ہے۔ اس کے سوا کسی کو آئین سازی کا حق نہیں ہے۔ ریاست اس کے تابع ہوتی ہے۔ ریاست کا کام قانون بنانا نہیں بلکہ ایک بنے بنائے خداوندی قانون کو چلانا ہے۔ اسلامی ریاست کو کوئی اختیار حاصل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس کی ماتحت اور پابند ہے۔ اسلامی حکومت میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہر شخص کی اطاعت سے مقدم ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ احکامِ خداوندی کی تابع ہے۔ اور اگر وہ خدا کے احکام کی اطاعت نہ کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں اس اصول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ — اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کا کہا

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (سورہ نساء۔ ۵۹)	اور جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں اللہ اور رسول دونوں کے لئے "اطیعوا" کا لفظ الگ الگ لایا گیا ہے اولی الامر کے لئے "اطیعوا" کے لفظ کو دہرایا نہیں گیا۔ واو عاطفہ کے ذریعے اس کو "الرسول" سے ملا دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اصلی اور غیر مشروط ہے۔ بخلاف ازیں مسلم حکام کی اطاعت اصلی نہیں بلکہ اللہ ورسول کے زیر اثر اور اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ اللہ ورسول کے اطاعت شعار ہوں۔ جب عوام اور اصحاب الامر میں تنازعہ واقع ہو تو اس کو اللہ ورسول کی طرف لوٹانے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ متنازعہ امور میں صرف اللہ و رسول کا حکم ہی آخری سند ہو سکتا ہے۔ حاکم اس میں فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ"	خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"اصحاب الامر کی بات سننا اور اس کی تعمیل کرنا مسلمان پر لازم ہے خواہ یہ بات اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ اگر حاکم خدا کی نافرمانی کا حکم صادر کرے تو نہ اس کی بات سننا ضروری ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔" (بخاری و مسلم)

مذکورہ صدر آیت میں "منکم" (تم میں سے) کی شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اصحاب اقتدار جن کو قیمتی اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ اس آیت کی رو سے اسلامی ریاست کی کلیدی آسامیوں پر فائز ہونے کا حق انہی لوگوں کو دیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ ملکی نظم و نسق بخوبی چلتا رہے۔ اور اس میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے تابع رہے۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب الامر سے بحث و مذاکرہ اور ان پر تنقید و محاسبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ان سے اختلاف کرنے کا جواز بھی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ تنقید و محاسبہ اور اختلاف آئینی حدود کے اندر ہونا چاہیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

"تم پر ایسے لوگ بھی حاکم بن کر آئیں گے جن کی بعض باتوں کو تم پسند کرو گے اور بعض کو ناپسند کرو گے۔ جس نے ان کے برے افعال پر تنقید کی وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور ان کی پیروی کرنے لگا وہ پکڑا جائے گا۔" (صحیح مسلم)

حکام کی اطاعت کے لئے جو شرط لگائی گئی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریہ کی تعمیل کرنا ہے۔ اس میں ایک اصول کی اطاعت کی جاتی ہے۔ صرف اقتدار کے سامنے سر جھکانا مقصود نہیں۔ اسلامی ریاست کے نظریاتی ہونے سے چند امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں ریاست مقصود بالذات نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اس طرح اسلام اور فاشزم کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ریاست ایک مقصد

کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اور فرد کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی۔

۲۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو اس بات کا سہولت بہم پہنچانا ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کو پورا کر سکیں۔ اسلامی ریاست خود بھی احکام خداوندی کی مطیع ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" (میں اولیں اطاعت گزار ہوں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا سربراہ بھی ایک عام شہری کی طرح اسی قانون کا پابند ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست بڑی حد تک ایک لادینی حکومت سے مختلف ہے۔ لادینی حکومت آسمانی و الہامی ہدایات کے بر عکس محض عقلی ڈھکوسلوں کی پیروی کرتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار بھی ہو سکتی ہے۔ اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالفت بھی کر سکتی ہے۔ بخلاف ازیں اسلام دینی ہدایات کی روشنی میں دنیوی معاملات کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

سوال نمبر ۸۹ :۔ "اولی الامر منکم" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کلیدی آسامیوں پر تعینات نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ جانب داری اور بے جا تعصب نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

جواب :۔ اسلامی ریاست ان غیر مسلموں سے بیحد فراخدلی اور رواداری کا سلوک کرتی ہے جو اس کے وفادار ہوں۔ اور مسلمانوں کی طرح اسلامی ریاست میں اقامت گزین ہوں۔ اس ضمن میں اسلام نے جس وسعت قلب اور غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں مسلم سلاطین ایک عرصہ دراز تک برسر اقتدار رہے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ہندوؤں کو نہ صرف حکومت کی کلیدی آسامیوں پہ فائز کیا بلکہ وہ ان کے عہد حکومت

ہیں ہر طرح مسرور و شادماں رہے اور کبھی شکایت کی نوبت نہ آئی۔ مذہبی رواداری
اور بے تعصبی کے لئے اکبر کا عہد حکومت ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلم سلاطین کی
یہ رواداری ان اسلامی تعلیمات کی غمازی کرتی ہے جن سے متاثر ہو کر انہوں
نے غیر مسلموں سے یہ طرز عمل اختیار کیا۔ اسلامی ریاست حدود ملک میں غیر مسلموں
کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ وہ ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب
کا پورا تحفظ کرتی ہے۔ معاشی اعتبار سے ان کو وہی آزادی حاصل ہے جو اہل اسلام کو

ان تمام سہولتوں کے باوصف جو اسلامی ریاست غیر مسلم رعایا کو دیتی ہے
وہ اس بات کو گوارہ نہیں کرتی کہ اس کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو ان اصول و قواعد
کو سرے سے مانتا ہی نہیں جن کی اساس پر وہ ریاست معرض وجود میں آئی ہے۔
اور جو اس کے مقصد وجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف اسلامی ریاست ہی کی
خصوصیت نہیں بلکہ دنیا کی کوئی نظریاتی مملکت اپنے اندر اتنی لچک پیدا نہیں کر سکتی۔
کہ وہ ایسے شخص کو اپنا سربراہ بنا لے جو اصولی طور پر اس سے متفق نہیں اور جن نظریات
پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہ بات اس قدر معقول ہے
کہ آج دیار مغرب کے رہنے والے بھی اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے
نتیجہ میں ایک غیر اشتراکی شخص اشتراکی ریاست کا سربراہ نہیں بن سکتا۔ ایک
فاشسٹ ریاست کا صدر ایک اشتراکی نہیں بن سکتا۔ اس کی حد یہ ہے کہ جن ممالک
میں جمہوری حکومت رائج ہے ان میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ آیا جمہوریت پر
ایمان نہ لانے والوں کو وہاں مسند اقتدار پر فائز کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جب کیرالا کے
الیکشن میں اشتراکیوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو سیاسی مفکرین کے یہاں یہ
سوال ابھرا کہ آیا ایک جمہوری ملک میں اشتراکیت پسند لوگ برسراقتدار آسکتے ہیں
یا نہیں؟ (دیکھیے برٹرینڈ رسل کا مضمون در مانچسٹر گارڈین ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء)

ڈیلی ٹیلیگراف لندن کا سیاسی مبصر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

"ہم اشتراکی پارٹی کو اقتدار کے لئے جدوجہد کی آزادی اس لئے دیتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اگر اس کی کامیابی کا کوئی بھی امکان پیدا ہو جائے تو ہماری سیاسی فطرت ہمیں فوراً یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ ہم اپنے جمہوری نظریات کو بدل لیں۔ اشتراکیت امریکی و برطانوی جمہوری روایت کو اس بری طرح تہ و بالا کر دیتی ہے کہ اشتراکیوں کی انتخابی فتح کو بھی جمہوری قرار دینا نہایت کھلے ارتداد کے مترادف ہوگا۔"

مغربی ممالک میں شہریوں کے درمیان مذہبی بلکہ وطنی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ انگلستان میں سربراہ حکومت کیلئے ضروری ہے کہ وہ پروٹسٹنٹ ہو اور انگلینڈ کی کلیسا سے وابستہ ہو۔ آئرلینڈ کے صدر کے لئے کیتھولک عیسائی ہونا ضروری ہے۔ ارجنٹائن کا صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک فرقہ کا عیسائی ہی ہو سکتا ہے۔ ڈنمارک کے بادشاہ کے لئے ایونجلیکل چرچ کا عیسائی ہونا ضروری ہے۔ سویڈن میں بادشاہ اور سٹیٹ کونسل کے ممبروں کے لئے ایونجلیکل ہونا لازمی ہے۔ یونان کے بادشاہ کے لئے مشرقی کلیسا کا پیرو ہونا اور سپین کے صدر کا رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور کی رو سے سربراہ مملکت صرف بدھ مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔

جب یہ تمام ریاستیں جو اپنے کو لامذہب (SECULAR) کہتی ہیں، سربراہ مملکت کیلئے ایک خاص مذہب کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو بنیادی طور پر ایک نظریاتی ریاست ہے اور اس بات کا صاف اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ ایک اصولی ریاست ہے یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی کلیدی آسامیوں پر وہ لوگ فائز ہوں جو اس کے اصول وقواعد ہی کے منکر ہیں۔

اسلام اور لادینی ریاست

سوال نمبر ۹ :- لادینی تحریک کیونکر پیدا ہوئی اور اس نے مغربی زندگی پر کیا اثرات ڈالے؟ مدلل لکھئے۔

جواب :- یورپ کے تاریک ادوار (DARK AGES) میں جب پوپ نے وسیع اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مذہب کا انکار کرنے والوں پر ظلم ڈھانے شروع کئے تو مغربی منکرین اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوپ نے بادشاہت سے گٹھ جوڑ کر کے اس نئی تحریک کو کچل دینا چاہا۔ پوپ کے ظلم و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمیافتہ لوگ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو گئے۔ اس بغاوت نے لادینی سیاسی تحریک کو جنم دیا۔ یہ نئی تحریک باقاعدہ اس وقت اٹھی جب ۱۹۳۲ء میں جیکب ہولیک نے سیاست و مذہب کی دوئی کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اس تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت جلد یہ مقبول ہو گئی۔ یہ تحریک اس دعویٰ کو لیکر اٹھی تھی کہ مذہب ایک پرائیویٹ چیز ہے اور اجتماعی و سیاسی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آغاز کار میں صرف یہ بات پیش نظر تھی کہ ہر شخص کسی مذہب کو اختیار کرنے نہ کرنے میں آزاد ہے۔ اور اس میں کسی کو جبر یا مداخلت کا حق حاصل نہیں لیکن بعد میں اس تحریک کے داعی مذہب کے مخالف اور فلسفہ مادیت یا اشتراکیت کے مبلغ بن گئے۔ اس تحریک کو اعتدال میں لانے کی بہت کوشش کی گئی۔ مگر اس ضمن میں سب مساعی بیکار ثابت ہوئیں۔ نتیجہ ایک لادینی تحریک کی صورت میں نکلا جو اب اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے۔ اور جس کے اثرات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

لادینی تحریک کے اثرات :- لادینی تحریک جب ایک مرتبہ شروع ہوئی تو پڑھتی ہی چلی گئی۔ اس سے مندرجہ ذیل اثرات ظہور پذیر ہوئے :-

۱۔ لادینی تحریک کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت قلق و اضطراب، شکوک و شبہات اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ اس فکری انتشار نے اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں کو جنم دیا اور انسان کو مادہ پرستی کے جہنم میں جھونک دیا۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد آر۔ این کیریونٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اشتراکیت غربت و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے اس لئے کہ اس کی اصلی کشش پچھلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلہ میں اچھی تنخواہ پانے والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کیلئے ہے یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی نا انصافیوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔ اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ میں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے۔ جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ دوسرے اصولوں کا علم بردار ہو۔"

۲۔ لادینی تحریک کا دوسرا اثر یہ رونما ہوا کہ افراد خود غرضی، لذت پرستی اور نفسانی خواہشات کی بندگی میں مبتلا ہو گئے۔ اجتماعی زندگی ظلم و تعدی سے بھر گئی اور ملکی و قومی زندگی کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق باقی نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس صدی نے دو ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک و زخمی ہونے والوں کی مجموعی تعداد تاریخ عالم کی تمام جنگوں میں قتل اور زخمی ہونے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

۳۔ لادینی تحریک کے تمام اخلاقی اثرات بھی بڑے مہلک ثابت ہوئے۔ استقامت

واستقلال، جرأت و شجاعت اور پامردی و مردانگی جیسے جوہر منسوخ ہو گئے نیکی اور بدی میں کوئی فرق نہ رہا۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد یہ ٹھہری کہ جو چیز بھی فائدہ مند اور افادیت و مصلحت کی موجب ہو وہ جائز اور درست ہے جو کام جیسے بھی بن پڑے نکال لیا جائے اس میں کوئی اخلاقی قباحت نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ میں لاتعداد برائیاں پیدا ہو گئیں جنہوں نے امن و سکون غارت کر دیا نیکیاں روپوش ہو گئیں اور برائیاں منظر عام پر جلوہ گر ہو گئیں۔ یہ سب لادینی تحریک کے برگ و بار ہیں۔

۴۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا جائے اور کوئی اعلیٰ اخلاقی و روحانی مقصد پیش نظر نہ ہو تو مادی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لادینی تحریک کی ناکامی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اگر دنیوی عیش و مسرت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا جائے تو انسان سے مادی خوشحالی اور دنیوی راحت و سکون بھی حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر کوئی بلند روحانی مقصد پیش نظر ہو تو اس کے ضمن میں انسان کو دنیوی مسرت و شادمانی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔"

۵۔ اصل بات یہ ہے کہ لادینی تحریک اب فرسودہ اور داستان پارینہ بن چکی ہے اب اس کی ناکامی کا راز طشت از بام ہو چکا ہے۔ جن مخصوص حالات میں اس تحریک نے جنم لیا تھا وہ اب ماضی کی یادگار بن چکے ہیں اور تاریخ ان سے ہزاروں میل آگے نکل گئی ہے۔ تاریخ بڑی تیز رو ہے اور اس کی بادرفتاری کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کچھ خاص قسم کے تاریخی عوامل تھے جنہوں نے ایک مخصوص و متعین فضا پیدا کر کے اس تحریک کو بروئے کار لانے میں مدد دی تھی۔ ان عوامل کی عدم موجودگی میں یہ تحریک زندہ

نہیں رہ سکتی۔ دورِ حاضر میں وہ عوامل سب ختم ہو چکے ہیں اس لئے سیکولرزم کا زندہ رہنا اب محالات میں سے ہے۔

سیکولرزم کا خاص نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کے سیاسی اور ریاستی معاملات میں ان کو پوری آزادی حاصل ہو اور مذہب اس پر کوئی مداخلت نہ کرے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سیکولرزم کا خصوصی نصب العین انسانوں کو انفرادی قومی اور معاشی امور میں مکمل آزادی دینا تھا۔ یہاں تک کہ ریاست یا کوئی ادارہ بھی اس آزادی میں مخل انداز نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ریاست کی حیثیت صرف ایک دفاعی ادارہ کی ہو جس کا مقصد صرف اندرونی نظم کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملہ سے بچانا ہے۔ اس قسم کی ریاست میں فرد کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جیسے چاہے زندگی بسر کرے۔ یہ تصورِ ریاست انیسویں صدی میں موجود تھا مگر اب بدل چکا ہے۔ آج ریاست کی حیثیت ایک ہمہ گیر ادارہ کی ہے جس میں تقریباً انسانی زندگی کے سب شعبے شامل ہیں۔ آج یہ ممکن نہیں کہ ریاست انسانوں کو مکمل آزادی دے کہ جیسے چاہیں کریں۔ آج ریاست کا ادارہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا اور اسے اپنے آپ سے ہم آہنگ بناڈالتا ہے۔

دورِ حاضر میں حکومت علم کی شمع روشن کرکے جہالت کو ملک بدر کرتی ہے۔ دولت کی مساوی تقسیم سے غربت کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ آج حکومت کا دائرہ کار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ سماجی برائیوں کا انسداد کرنا شہریوں کی تعلیم و تربیت بیماروں کا علاج مظلوموں کی دادرسی مجبور و معذور لوگوں کی امداد حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ آج کل کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لئے نظریاتی غیر جانبداری کسی طرح ممکن نہیں۔ موجودہ ریاست کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور اختیار کرے گی۔ بھلائی یا برائی، کامیابی یا ناکامی میں سے

کسی ایک کو اختیار کرنا اور اس کی روشنی میں اپنا طریق کار متعین کرنا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست بنتی چلی جارہی ہے۔ سیکولرزم جن بنیادوں پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اب ان کی یاد صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ البتہ حقیقت کی دنیا میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ لا دینی تحریک کے آثار اب ماضی کی یادگار بن چکے ہیں۔ اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ نہ اس کی گنجائش کا کوئی امکان ہے۔ تاریخ اسے پیچھے چھوڑ کر ہزاروں میل آگے بڑھ چکی ہے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ سیکولرزم کے عین برخلاف نظریاتی ریاست قائم کی جائے جو اس کی ضد ہے اور جس کو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ سیکولرزم کی تحریک ایک خاص ماحول اور متعین گردوپیش کے نتیجہ میں اٹھی تھی جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی ضروریات اس کے مخصوص حالات اور تقاضے پکار پکار کر کہہ سکتے ہیں کہ اب ایک نظریاتی ریاست کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ دورِ حاضر کی اس پکار کا جواب اسلام کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

سوال نمبر ۹۱:۔ اسلامی ریاست اور قومی ریاست کے مابین نقطۂ فرق و امتیاز واضح کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ قومی ریاست نظریۂ قومیت کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ یہ ریاست محض رنگ و نسل، قوم و وطن، زبان و بیان اور کالے گورے کے امتیاز پر قائم ہوتی ہے کسی ملک کا حدودِ اربعہ، اس کے پیمانہ اور میدان، اس کا خاص رنگ ڈھنگ اور اس کے خصوصی خدوخال اس کی حدبندی کرتے ہیں۔ یہ امتیازات قومی حکومت کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اس کے عین برخلاف اسلامی حکومت ان امتیازات اور حدود سے آشنا نہیں۔ اس کے یہاں کالے گورے، عربی عجمی، زنگی و فرنگی، امیر و غریب اور آقا و غلام کی کوئی تمیز نہیں۔ وہ جغرافیائی حد بندیوں اور قومی خصوصیتوں کی قائل نہیں۔ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے جو شخص اس کی دعوت پر لبیک کہتا ہے اور اس کے افکار و آراء کو دل و جان سے قبول کر لیتا ہے۔ وہ اس کا فرد بن جاتا ہے۔ یہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کس قوم کا فرد ہے؟ کونسی زبان بولتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ یہ ریاست انسانی برادری اور بین الاقوامیت کی اساس پر معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کا نظریہ قومیت مصنوعی اور عارضی عوامل کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید قسم کا نظریہ ہے جو لوگ بھی اس کے اصولوں کو اپنالیں وہ ایک امت اور ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ یہ ریاست آغاز کار میں اپنے لئے ناگزیر طور پر کچھ جغرافیائی حدود اور ایک خاص ملک و وطن تو اختیار کرتی ہے لیکن یہ اپنے آپ کو اس میں محدود نہیں رکھتی۔ اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ رنگ و نسل، قوم و وطن اور اس قسم کی محدود پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالمگیر ریاست قائم کرے۔ اس طرح اسلامی ریاست ان ریاستوں سے بھی مختلف ہو جاتی ہے جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہے اور جن کے پیش نظر کوئی نظریہ اور دعوت نہیں۔

اسلام اور تھیاکریسی

سوال نمبر ۹۲ :- اسلامی ریاست اور تھیاکریسی کا فرق واضح کیجئے؟

جواب :- اسلامی ریاست اور تھیاکریسی میں بنیادی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مقاصد، معیار و مدار، طرز و انداز اور طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مستشرقین یورپ نے جس طرح اسلام کو اپنے تراشیدہ اتہامات کا نشانہ بنایا ہے ان میں

سلسلہ ایک یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حکومت دراصل تھیاکریسی کا چربہ ہے۔ تحقیق فریقین سے معلوم ہوتا ہے کہ مستشرقین یورپ کا یہ اتہام قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسلامی ریاست اور تھیاکریسی میں حسب ذیل فرق پایا جاتا ہے۔

تھیاکریسی کی تعریف | تھیاکریسی (THEOCRACY) کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں خدا کو مرکزِ اقتدار تصور کیا جاتا ہے اور مذہبی نمائندے اور پروہت خدا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کا نظم برقرار رکھتے ہیں۔"

مذاہب کے انسائیکلوپیڈیا میں تھیاکریسی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"تھیاکریسی حکومت کی ایک ایسی قسم ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جاتا ہے۔ حقیقی حکمران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور ان کے احکام کو خداوندی احکام سمجھا جائے۔" (مذہب اور مذاہب کا انسائیکلوپیڈیا ص ۳۷۳)

تاریخی اعتبار سے یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں کی حکومتوں کو صحیح معنوں میں تھیاکریسی حکومتیں کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست بلاشبہ خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر اس میں اور تھیاکریسی طرزِ حکومت میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مابین فرق و امتیاز کے خصوصی خد و خال یہ ہیں۔

ا۔ تھیاکریسی میں نظری طور پر خدا کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے مگر عملاً اقتدار پر ایک مذہبی طبقہ قابض ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوتے ہیں۔ اس کی رائے کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس طبقہ کو تنقید و محاسبہ سے بالا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ بلا جھجک تمام اختیارات استعمال کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے محاسبہ کا حق نہیں رکھتا۔ اسلام میں ایسا کوئی طبقہ نہیں پایا جاتا جو تنقید و محاسبہ سے بالا ہو۔

اسلام میں بندہ اور خدا کے تعلق کو جوڑنے کے لئے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں

بندہ براہ راست خدا سے اپنا رشتہ قائم کرسکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات ہر فرد بشر کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف واشگاف ہیں بلکہ ان سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کو عملی طور پر اپنانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسلام میں حکام بالا خدا کے سامنے اسی طرح جوابدہ ہیں جیسے ایک عام آدمی۔ دونوں میں قطعی طور سے کوئی فرق نہیں۔ اسلام میں اصحاب الامر کے لئے علم اور تقویٰ کے سوا کسی شرط کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اور علم و تقویٰ کی راہیں سب کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں، یہ کسی فرد بشر کی میراث نہیں۔

۲۔ اسلامی تاریخ کے اوراق اس برہمنیت اور پاپائیت کے وجود سے یکسر خالی ہیں۔ جو یورپ، ہندوستان، جاپان اور تبت میں پائی جاتی ہے۔ مسلم علماء قدیم ہی سے حق کے محافظ اور آزادی کے علمبردار رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آزادی کی جدوجہد میں مجاہدانہ سرگرمی دکھائی اور ظلم و ستم اور جور و استبداد کا نشانہ بنے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی سرہندی رحمہم اللہ اور ان کے ہزاروں رفقاء کی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں علماء کا کوئی خاص طبقہ نہیں ہے۔ اسلام میں علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں علم کی راہ ہر شخص کے لیے کھلی ہے۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ "مذہبی دیوانوں" نے کبھی عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہو۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ میں یورپ اور ہندوستانی تاریخ میں برہمن نے بنایا ہے۔ مغربی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت نے یورپ کے تھیاکریسی نظام حکومت کی طرح عوام کو کبھی ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنایا۔

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"مشرق (یعنی عالم اسلام) میں تھیاکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ مغربی دنیا (بشمول روم و یونان) جس ظلمت پسندی، علم اور آزادی رائے پر پابندی کے لئے مشہور ہے۔ اس کی مثال ہمیں اسلامی دنیا میں نہیں ملتی۔"

(THE MAKING OF HUMANITY P. 113)

۳۔ تھیا کریسی میں خدا کا نام تو موجود تھا مگر زندگی کے گوناں گوں مسائل حل کرنے کے لئے کوئی الہامی ہدایت موجود نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادریوں اور پروہتوں نے اپنی رائے سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور خدا کے نام سے اپنا قانون جاری کیا۔ ان کا بنایا ہوا قانون، تمام انسانی خواہشوں کا مظہر تھا۔ ایک خاص طبقہ کے امتیازی مفادات کا تحفظ اس پر مزید تھا۔ نتیجہ بے انصافی اور ظلم و تعدی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ مذہبی طبقہ کو تنقید و محاسبہ سے بالا قرار دیا گیا تا کہ اس کی ہر بات بلا روک ٹوک مان لی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔

اسلامی ریاست کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں ایک آسمانی کتاب ہدایت موجود ہے۔ یہ کتاب جس کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گذر چکی ہیں جوں کی توں محفوظ ہے اس میں سر مو تغیر رونما نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ کتاب الٰہی میں اصحاب الامر سے اختلاف کرنے اور ان کو ہدف تنقید بنانے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ اسے فرض قرار دیا گیا ہے تا کہ ان کے قدم جادۂ مستقیم سے ڈگمگا نہ جائیں۔ کتاب الٰہی کو آخری سند کا درجہ حاصل ہے اور ہر شخص صرف اسی کو دلیل و برہان کے طور پر پیش کرنے کے لئے مجبور و مامور ہے ہر شخص براہ راست قرآن سے استفادہ کرنے کا مجاز ہے۔ علم القرآن کسی کی میراث نہیں صرف جہد و سعی مطلوب ہے۔ اس سے اسلامی نظام حکومت اور تھیا کریسی کی راہیں جدا جدا ہو جاتی ہیں۔

۴۔ اسلام اور تھیا کریسی کے مزاج میں ایک نمایاں اور اہم فرق یہ بھی ہے کہ تھیا کریسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ دنیا قابل نفرت ہے۔ لہٰذا اس سے جس قدر جلد نجات حاصل ہو سکے غنیمت ہے۔ یہ نحیت اور بدوصمت نے تو آواگون کے عقیدے کے مطابق دیتوی زندگی کو کسی پہلی زندگی کے گناہوں کی پاداش ٹھہرایا اس لئے یہاں الم و رنج اٹھانا ناگزیر ہے۔ یہ دنیا دار العذاب ہے۔ اس زاویۂ نگاہ نے عوام کو ریاست کی اصلاح اور برسر اقتدار طبقہ

کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے جبر و ستم کے سامنے سپر ڈال دی اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کیا۔

اسلام کا طریق کار اس سے یکسر مختلف ہے۔ انسان اس کائنات ارضی پر خدا کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ خدا نے ہی زندگی کی نعمتیں پیدا کی ہیں اور انسان سے متمتع ہونے کی اجازت عطا کی ہے۔ اسلام میں حکومت و ریاست کا اولین مقصد بھلائی کو فروغ دینا اور ایک صالح معاشرہ کو قائم کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اسلامی نظام ریاست تھیاکریسی کی ضد ہے اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی اور مقصدی ریاست ہے۔

شورائی اور جمہوری ریاست

سوال نمبر ۹۳ :۔ شوریٰ اور جمہوریت کو اسلامی ریاست میں کیا مقام حاصل ہے؟ تفصیل لکھیے۔

جواب :۔ نظریاتی ریاست ہونے کے بعد اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست ہے۔ اس میں تمام انسانوں کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ رنگ و نسل حسب و نسب اور قوم و وطن کی اساس پر کسی گروہ کو یہاں کوئی برتری حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد وحدت انسانیت احترام آدمیت اور مساوات بنی آدم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں سب کو یکساں حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو تفویض کی جاتی ہے جن پر ملت اعتماد کرتی ہو۔ اصحاب الامر تمام امور سلطنت باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ تمام شہریوں کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ حکومت ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔ اور ان کے لئے خدا اور مخلوق کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسلام میں ڈکٹیٹر شپ اور شہنشاہیت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ خالص جمہوری اور شورائی نظام حکومت کا حامل ہے۔

اسلامی ریاست میں جمہوریت کی بنیاد چار باتوں پر رکھی گئی ہے۔ اب ان پر ترتیب وار روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ انسانی مساوات کا نظریہ | اسلامی جمہوریت کی بنیاد انسانی مساوات پر رکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً" (سورۃ نساء۔ ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیں۔

دوسری آیت میں فرمایا۔

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" (الحجرات۔ ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا۔ تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز ترین وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔

ان دونوں آیتوں سے وحدتِ انسانی اور مساوات ثابت ہوتی اور اور یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عظمت وفضیلت کا انحصار اخلاقِ عالیہ اور خوفِ خداوندی پر ہے حسب و نسب اور قوم و قبیلہ سے صرف تعارف مقصود ہے نہ کہ اظہارِ عزت و شرف۔

درج ذیل آیات سے روشن ہوتا ہے کہ انسان خدا کے نزدیک اکرام و احترام کے لائق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد احترامِ آدمیت پر رکھی گئی ہے۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔" (سورۃ التین)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین قد و قامت کا پیدا کیا ہے۔

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ" بنی اسرائیل ۔۱۱ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی وحدت و مساوات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ أَنَا شَهِيْدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ" — اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔

(مسند احمد۔ ابو داؤد)

فتح مکہ کے بعد مجمع عام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اس میں فرمایا۔

"خوب سن لو کہ فخر و غرور کا ہر سرمایہ خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ تعالیٰ نے دور جاہلیت کا کبر و فخر اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو ختم کر دیا ہے۔ اے لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ حسب و نسب باعث فخر نہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت جتلانے کا کوئی حق نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔"

کتاب و سنت کے ان نصوص سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حاکم و محکوم، آمر و مامور، عربی و عجمی، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔ اسلامی قانون میں سب برابر ہیں۔ ایک دفعہ ایک معزز خاتون چوری کی مرتکب ہوئی بعض صحابہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں گذارش کی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ آپؐ نے یہ سفارش قبول نہ کی اور فرمایا۔

"وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" — اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

(مسلم)

یہ ہے وہ معاشرتی اور قانونی مساوات جس سے بہتر مساوات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اولی الامر کی اہلیت و صلاحیت — اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ

اس کے اولی الامر اور سربراہ کار اس قابل ہوں کہ انہیں یہ عظیم ذمہ داری تفویض کی جائے اور لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَتَدْعُونَ لَهُمْ وَيَدْعُونَ لَكُمْ وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَدْعُونَ عَلَيْهِمْ وَيَدْعُونَ عَلَيْكُمْ وَفِي رِوَايَةٍ تَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ (صحیح مسلم)

تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں، تم ان کے لئے اور وہ تمہارے لیے دعا بھی کرتے ہوں اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اور وہ تمہیں ناپسند کرتے ہوں۔ تم ان کیلئے اور وہ تمہارے لئے بددعا کرتے ہوں۔

ایک حدیث میں بددعا کی بجائے لعنت کا لفظ آیا ہے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس ضمن میں متحد الخیال ہیں کہ اصحاب الامر کا عوام کے نزدیک قابل اعتماد ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ خلیفہ و امام کا تقرر و انتخاب کیسے اور کیونکر ہو۔ اس ضمن میں شیعہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ خانوادۂ نبوّت کے سوا کوئی شخص امامت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ خدا کی جانب سے منصوص ہوتا ہے۔ کسی کو اس کے مقرر کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اس لئے انتخاب امام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ انتخاب کے اصول کو صحیح مانتا ہے۔ مگر ان کے نزدیک بھی امامت و خلافت کے حقدار صرف خاندان نبوت کے افراد ہیں۔ خوارج کی رائے میں ہر صالح اور نیک چلن آدمی خلافت کا اہل ہے۔ البتہ کسی معقول وجہ کے بغیر خلیفہ و امام کو معزول کرنا درست نہیں۔ معتزلہ کے نزدیک خلافت و امامت کیلئے سرے سے کوئی قید ہی نہیں۔ ہر شخص اس منصب کا اہل ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا قریشی یا کسی اور خاندان سے

ہونا شرط نہیں۔ لیکن خلافت کی اہلیت کیلئے علم و اجتہاد، اعلیٰ سیرت و کردار، عقل و دانش، بیدار مغزی اور فنون حرب و ضرب میں مہارت لازمی شرائط ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ کے طریق تقرر و انتخاب کے باوجود مسلمانوں کے تمام فرقے اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ اسلامی ریاست کے اصحاب الامر کا قابل ہونا ضروری ہے۔

۳۔ **شوریٰ** اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے۔ شوریٰ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہ قابل اعتماد افراد امور سلطنت کو خداوندی احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ کی روشنی میں طے کریں۔ مشورہ اس قدر ضروری چیز ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن میں فرمایا۔

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" (آل عمران۔ ۱۵۹) اور ان سے معاملات میں مشورہ کیجئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

"مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ مَشُورَةً لِأَصْحَابِهِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (بخاری و ترمذی) میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا۔

اللہ تعالیٰ اصحاب الامر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (الشوریٰ۔ ۳۸) اور وہ اپنے امور مشورہ کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔

مشہور محدث خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور آپس

میں مشورہ کرو اور کسی ایک شخص کی رائے کے مطابق فیصلہ نہ کرو۔" (تفسیر روح المعانی)

ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرہ کی منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"اِذَا کَانَ اُمَرَاءُکُمْ خِیَارَکُمْ وَاَغْنِیَاءُکُمْ سُمَحَاءَکُمْ وَاَمْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِّنْ بَطْنِهَا۔" (ترمذی)

جب تمہارے حاکم تم میں سے بہترین لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند سخاوت پیشہ ہوں اور تمہارے معاملات مشورہ سے طے ہوتے ہوں تو زمین کی سطح تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں مشورہ کی عادت باقی رہے گی تو ان میں شوریٰ اور جمہوریت کی روح زندہ رہے گی اور وہ ایک عظیم قوم کی حیثیت سے دنیا میں کامرانی اور شادکامی کی زندگی بسر کریں گے۔ جب مشورہ نہیں ہوگا تو لوگوں میں خود پسندی اور خودسری پیدا ہو جائے گی جس سے طرح طرح کے تنازعات سر نکالنے لگیں گے اور اس کا انجام اختلاف و شقاق کی صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔

علمائے قانون کا قول ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی ریڑھ اور اس کا جزو لاینفک ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور ماہر قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں۔

"اِنَّ الشُّوْرٰی هِیَ مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِیْعَةِ وَعَزَائِمِ الْاَحْکَامِ"

(رسنانی ۔ جلد اول)

شوریٰ شریعت کے قواعد اور نہایت ضروری احکام میں سے ہے۔

تمام اہم امور میں مشورہ لازمی چیز ہے۔ اسلام میں شوریٰ کی کوئی متعین صورت

نہیں ہے کہ ہر زمانہ کے حالات اور ضروریات کے مطابق اس کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ارباب شوریٰ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصحاب فہم و ادراک، دیندار، قابل اعتماد اور صاحب بصیرت و فراست ہوں۔ تمام اہم امور شوریٰ سے طے کئے جائیں۔ کوئی شخص من مانی کارروائی نہ کرے۔ مشورہ آزادانہ فضا میں ہو اور ہر طرح سے بے لاگ اور بے لوث ہو۔ اجتماعی کام جن لوگوں سے متعلق ہوں شوریٰ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو بلایا جائے۔ جب تک آزادیٔ رائے اور بے لاگ اظہار خیال کی فضا پیدا نہ کی جائے شوریٰ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ شوریٰ کی کوئی متعین صورت نہیں۔ اصل چیز آزادانہ اظہار خیال اور بے لاگ اظہار رائے ہے۔

۴۔ **شہریوں کے حقوق و فرائض** اسلامی ریاست کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ اس میں شہریوں کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ ان حقوق میں کوئی شخص مداخلت کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ حقوق اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں ان میں کسی رد و بدل کا امکان نہیں۔ حکومت کے پاس جب تک شرعی دلیل موجود نہ ہو وہ کسی کے حقوق پر پابندی عائد نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا کرے گی تو وہ عوام کے علاوہ خدا اور رسولؐ کے نزدیک بھی مجرم ٹھہرے گی۔ اسلامی شریعت میں ظالم حاکم بروز آخرت بدترین سزا پائے گا۔ اسلامی ریاست میں شہریوں کی دو قسمیں ہیں (۱) مسلم شہری (۲) غیر مسلم شہری۔

غیر مسلم شہریوں کو اسلامی ریاست میں تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں انہیں کامل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے۔ چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہے اس لئے غیر مسلم شہری اس کی کلیدی آسامیوں پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی نسبت ان کی ذمہ داریاں کم ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

سوال نمبر ۹۴: اسلامی ریاست کے شہریوں کے حقوق کی تفصیل بیان کیجئے۔

جواب ۱۔ شہری سے مراد وہ انسان ہے جو بخوشی خاطر کسی معاشرہ، ریاست یا حکومت کے قانون و دستور کو قبول کر کے اس کی رکنیت اختیار کرے اور اس کے نصب العین کو صحیح مانے۔

شہریوں کے حقوق کا تحفظ ایسا شخص گاؤں میں رہتا ہو قصبہ میں یا کسی شہر میں اس ریاست کا شہری کہلائے گا۔ شہری ہونے کی حیثیت سے مسلم وغیر مسلم سب برابر ہیں۔ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے زیر سایہ بود و باش رکھتے ہوں ان کو ذمی کہتے ہیں۔ سب لوگ ریاست کے وفادار اور اطاعت شعار ہونے کی صورت میں ریاست کی حدود کے اندر سکونت پذیر ہوں گے۔ ریاست و حکومت ان کی معاشی و سیاسی اور مذہبی ضروریات کی کفیل ہوگی۔ ان کی حفاظت کا اہتمام کرے گی اور یہ اس کے صلہ میں حکومت کو مالی واجبات ادا کریں گے۔

دین اسلام نے شہری (مسلم ہو یا غیر مسلم) کے حقوق کا کامل تحفظ کیا ہے۔ دینی احکام کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد

چونکہ اسلام امن اور سلامتی کا پیامبر ہے لہٰذا اس نے حقوق العباد پر بڑا زور دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق العباد کا محاسبہ کیا جائے گا۔" اسلام نے بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کے لئے حقوق مقرر کئے ہیں۔ اس میں شہری کے حقوق بھی شامل ہیں۔ شہری کا مفہوم وسیع ہے۔ اسے مسلم شہری میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا دامن غیر مسلموں کے لئے ہمیشہ کشادہ رہا ہے قرآن میں فرمایا۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" (مائدہ - ۲)

کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف نہ کرو، انصاف کرو کیونکہ یہ تقویٰ کے بہت قریب ہے۔

اس آیت میں ہر فردِ بشر کو عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا تعلق کسی مذہب و ملت سے ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"تم زمین والوں پہ رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔" (مستدرک حاکم)۔

یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا۔

"جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ کچھ کھائے گا اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملے گا۔" (صحیح بخاری)

اس فیض کے عموم میں انسان کے علاوہ چرند پرند کو بھی داخل کر دیا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا۔

"تم اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔"

بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور عام انسان بھی۔

صدقہ و خیرات میں مسلم فقراء و مساکین کو ترجیح دینا ایک فطری چیز ہے۔ تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں غیر مسلم مسکینوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔ قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک غیر مسلم بوڑھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا کہ جزیہ کی ادائیگی اور بڑھاپے کی وجہ سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اسے کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ ایسے آدمیوں کی تلاش کرو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور بڑھاپے میں اس کی مدد نہ کریں۔

یہ مشہور مسئلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے

جا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ امّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام ہے۔ ابن جریج محدث فرماتے ہیں کہ قیدی کو کھانا کھلانا کارِ ثواب ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے۔ آنحضرت کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا (صحیح مسلم) روایات میں آیا ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے دست کش ہو گئے تو یہ آیت اتری۔

"ان کو ہدایت دینا تیرے اختیار کی بات نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پہ لے آتا ہے اور جو مال تم خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہیں پہنچے گا"۔ (سورۃ بقرہ۔۲۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" (مسند احمد جلد ۳ ص ۲۷۲)۔

اس حدیث میں انسانی محبت کی وسعت کو ساری انسانی برادری تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں۔

۱۔ جان و مال اور آبرو کی حفاظت ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اپنے شہریوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے۔ نہ خود ان کی عصمت و آبرو پر ڈاکہ ڈالے نہ دوسروں کو اس امر کی اجازت دے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللهِ وَرَسُولِهِ فَلَا تُخْفِرُوا اللهَ فِي ذِمَّتِهِ" (صحیح بخاری)	یہی وہ مسلم ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ اور رسول نے لیا ہے۔ تم اللہ کی ذمہ داری میں خیانت نہ کرو۔

آپؐ نے فرمایا۔

"كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ — ایک مسلم کی ہر چیز دوسرے پر حرام ہے
دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ" (صحیح مسلم) — اس کا خون، اس کا مال اور اسکی آبرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فرمایا۔

"جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور اس کا مال ہمارے مال کی طرح ہے"۔

حکومت تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:۔

"وَلَيْسَ لِلْإِمَامِ أَنْ يُخْرِجَ شَيْئًا — امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی ثابت
مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِحَقٍّ ثَابِتٍ — قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے
مَعْرُوفٍ" (کتاب الخراج ص۲۳) — اس کی کوئی چیز نکالے۔

۲۔ شخصی آزادی اسلامی ریاست میں ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہے۔ البتہ اسلامی حکومت کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے کے لئے استعمال کرے۔ یا حکومت کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔ یا اس کو کسی خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو حکومت اس میں مداخلت کرکے اس کو روک دے گی۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبہ کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ آپؐ دو مرتبہ سوال سن کر خاموش رہے تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے۔ اور جب اس ضمن میں کچھ بھی معلوم نہ ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔

"خَلُّوا لَهُ جِيرَانَهُ" (ابو داؤد) — ان کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ

"لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْإِسْلَامِ — عدل و انصاف کے تقاضوں کے بغیر اسلام

بغیر عدل" (موطا امام مالک) میں کسی کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ آزادیٔ رائے ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہے کہ جو نسا مذہب چاہے اختیار کرلے۔ دینِ اسلام اسلامی ریاست میں رہنے والوں کو پوری آزادیٔ رائے دیتا ہے اس ضمن میں قرآن کریم نے نرالے لاگ فیصلہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" (البقرہ ۲۵۶) دین میں جبر نہیں۔

اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کو تبدیلِ مذہب پر مجبور نہیں کرتی۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سلاطین اس ضمن میں بڑے کشادہ دل واقع ہوئے۔ عباسی خلافت کے زریں دور میں غیر مسلم بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کبھی ان سے مذہب تبدیل کرنے کے لئے نہ کہا گیا۔ خود ہندوستان میں یکے بعد دیگرے متعدد مسلمان خاندان وارثِ تخت و تاج ہوئے اگر وہ چاہتے تو سرزمین ہند کے طول و عرض میں کسی غیر مسلم کو زندہ نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے اس کے برخلاف وسیع النظری اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے غیر مسلموں سے رواداری برتی اور ان کو حکومت کی کلیدی اسامیوں پر فائز کیا۔

جس طرح ایک غیر مسلم کو اسلامی ریاست میں کامل مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اسی طرح مسلمانوں کو اس بات کی کھلی اجازت ہے کہ مختلف فقہی مسالک مثلاً حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی میں سے جو نسا طرزِ فکر چاہیں اختیار کریں یا براہِ راست کتاب و سنت کی پیروی کریں اور کسی فقہی مکتبِ خیال کی تقلید کو اپنے لئے ضروری نہ سمجھیں جس طرح آئمہ اربعہ کے ظہور سے قبل لوگ براہِ راست قرآن و حدیث کا اتباع کرتے تھے اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں کو کسی خاص مکتبِ خیال کی پیروی پر مجبور کرے۔ خلیفہ منصور و ہارون نے جب مالکی فقہ کو بزور ملک میں رائج کرنا چاہا تو امام مالکؒ نے یہ کہہ کر اس سے باز رکھا کہ علماء کا (فرعی) اختلاف اس امت کے لیے رحمتِ الٰہی

ہے۔ البتہ اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اندرونِ ملک کفر و الحاد کی ترویج و اشاعت کو روک دے اور ملک میں ایسے افکار و نظریات کو پھلنے پھولنے نہ دے جو اسلام کے بنیادی افکار و معتقدات سے متصادم ہوں۔

ریاست کا ہر شہری اس امر میں آزاد ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مذہبی روایات کے مطابق عبادت کر سکے اس کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں کا تحفظ اور ان کی تعمیر بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ مسلمان ہمیشہ یہود و نصاریٰ کے معابد کی حفاظت کرتے رہے ہیں اور انہوں نے کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خوارج نے فتنہ و فساد کا بازار گرم رکھا۔ وہ آپ کی خلافت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ تاہم آپ نے خوارج کو پیغام بھیجا تھا۔

"تم جہاں چاہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی اختیار نہ کرو اور ظلم سے باز رہو۔" (نیل الاوطار الشوکانی جلد ۷ ص ۱۳۹)

۴۔ قانونی مساوات | ریاست کے ہر شہری کو قانونی مساوات حاصل ہونی چاہیے۔ اسلامی ریاست کا قانون امیر و غریب مسلم و کافر عربی و عجمی سب کیلئے یکساں ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے قانونی مساوات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بلا معاوضہ ہو مسلم سلاطین کی قانونی مساوات ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت کا واقعہ ہے کہ آپ کی زرہ گم ہو گئی۔ زرہ کچھ مدت کے بعد ایک یہودی کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا اور حضرت علیؓ بذاتِ خود فریقِ مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں تشریف لائے۔ آپ کے پاس چونکہ گواہ نہ تھا اس لئے قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ آپ نے قطعاً بُرا نہ مانا۔ یہودی کو معلوم تھا کہ یہ زرہ حضرت علیؓ کی ہے لیکن قانونی ثبوت مہیا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ مل سکی۔ وہ اسلامی انصاف کا یہ عالم دیکھ کر ایمان لے آیا۔

۵۔ معاشرتی مساوات اسلامی ریاست کے باشندوں کو کامل معاشرتی مساوات حاصل ہے۔ اس میں تمام و نسب، رنگ و نسل، برادری یا خاندان، پیشہ و صنعت یا مقام سکونت کی بناء پر کوئی شخص صاحب عزت یا ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ عزت و فضیلت کا معیار و مدار تقویٰ پر ہے۔ یہاں ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔ سب یکساں سلوک کے حقدار اور یکساں حقوق و فرائض رکھتے ہیں۔

۶۔ بے لوث اور بلا عوض عدل و انصاف اسلامی ریاست ہر شہری کو ظلم و تعدی سے بچانے اور بلا معاوضہ عدل و انصاف مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عدل و انصاف مہیا کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ رعایا سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

۷۔ حق تنقید و محاسبہ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت پر تعمیری تنقید کر سکے۔ ہر شخص حکومت کو مشورہ دے سکتا ہے اور ہر بات پر ٹوک سکتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دوران عوام برملا خلفاء پر تنقید کرتے تھے۔ خلفاء نہ صرف اسے گوارا کرتے تھے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اسلامی ریاست میں ہر مظلوم کو فریاد خواہی کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص اپنے مسائل اور مشکلات افسران بالا کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۸۔ اجتماع و تنظیم اور نقل و حرکت کی آزادی اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے حق اجتماع، حق تنظیم اور نقل و حرکت کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ جہاں چاہیں اندرون ملک آجا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت کی جانب سے ان پر کوئی پابندی نہیں۔

سوال نمبر ۹۵:۔ اسلامی ریاست میں شہریوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل بیان کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست کے شہریوں پر یہ فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ حکومت کی اطاعت ایک شہری کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی مکمل اطاعت کرے۔ ملک کا وفادار ہو اور اس کی ترقی و سلامتی میں کوشاں رہے۔ قرآنِ کریم میں مسلم حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ۔ (ابن ماجہ)
تمہارا حاکم ایک حبشی غلام بھی ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو

ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی ہر صحیح بات پر عمل کرے۔ البتہ خلافِ شرع احکام کی اطاعت ضروری نہیں۔ آپ نے فرمایا۔

لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ۔
خدا کی نافرمانی والے کام میں کسی کی اطاعت درست نہیں۔

۲۔ قانون کا احترام قانون کا احترام بھی ایک شہری کے لئے ازبس ضروری ہے اگر سب لوگ قانون شکنی پر اتر آئیں تو ملک میں ابتری پھیل جائے۔ ہر اچھا شہری قانون کا احترام کرتا اور قانون شکنی کو جرم خیال کرتا ہے۔

۳۔ واجبات کی ادائیگی انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے حکومت بہت سے مصارف برداشت کرتی ہے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رعایا سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس لئے رعایا کا فرض ہے کہ حکومت کے واجبات بخوشی ادا کرے۔

۴۔ حکومت سے تعاون ہر شہری کا فرض ہے کہ حکومت سے تعاون کرے۔ قرآنِ کریم میں اسے فرض قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ ایثار و قربانی اگر ضرورت کا تقاضا ہو اور حکومت مال و جان کی قربانی کا مطالبہ کرے۔ تو اسلامی ریاست کے شہریوں کا فرض ہے کہ کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ جب حکومت جہاد کے لئے پکارے تو اس کی پکار پر لبیک کہا جائے البتہ غیر مسلم شہریوں سے جبراً فوجی خدمت نہیں لی جاسکتی۔ اگر وہ بخوشی ایسا کرنا

چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

۶۔ **تعمیری تنقید** | حکومت سے خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت کے شہری امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت کو صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دیں۔ اگر وہ کسی وقت اسلام کی راہ سے برگشتہ ہو رہی ہو تو ہاتھ اور زبان سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔

اسلام، اشتراکیت اور جمہوریت

سوال نمبر ۹۶:۔ اسلام کے سیاسی نظام اور اشتراکیت کا فرق واضح کیجئے؟

جواب:۔ مندرجہ ذیل امور اسلام کے سیاسی نظام اور اشتراکیت کے مابین وجہ امتیاز ہیں۔

۱۔ دین اسلام ایک کامل نظام حیات ہونے کی حیثیت سے زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ہدایات دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام شعبے خواہ وہ معاشی ہوں یا معاشرتی عمرانی ہوں یا سیاسی دینی حدود میں داخل ہیں۔ سیاست انسانی زندگی کا اہم جزو ہے اور اس لئے اسلام میں داخل ہے۔ اسلامی نظام حکومت دین کے زیر اثر رہتا ہے اور خدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے۔ جو سیاست دینی تصورات پر مبنی نہ ہو وہ سیاست نہیں چنگیزی اور فرعونیت ہے اس کے عین برخلاف اشتراکیت کی بنیاد ہی لادینی تصورات اور مذہب کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے وہ اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے ایک لادینی نظام ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان اساسی و اصولی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے اور دونوں کے راستے آغازِ کار ہی سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اشتراکیت کی نگاہ میں فرد کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ معاشرہ کی ایک اکائی ہے معاشرہ میں منظم ہو کر فرد اپنی حیثیت کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور جماعت سے الگ ہو کر اس کی کوئی جداگانہ اور مستقل شخصیت باقی نہیں رہتی۔ ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک ایک خاص طبقہ ہوتا ہے۔ اشتراکیت طبقاتی کشمکش کی قائل ہے۔ اس کے برخلاف اسلام طبقاتی تقسیم کا قائل نہیں۔ اس کے یہاں کوئی خاص طبقہ حکمران نہیں ہوتا سب انسان مساوی درجہ رکھتے ہیں، معاشرہ سے الگ بھی فرد اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام فرد کی ایک ذاتی حیثیت کو مانتا ہے اور اس کی اہلیت و صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لئے مواقع فراہم کرتا ہے۔

۳۔ اسلامی نظام حکومت ایک شورائی اور جمہوری نظام ہے۔ اس میں تمام معاملات باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ ہر کام لوگوں کی رضامندی سے کیا جاتا ہے خلیفہ و امام خدا اور لوگوں کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ رعایا اس پر تعمیری تنقید کر سکتی ہے۔ اصحاب الامر تنقید و محاسبہ سے بالا نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف اشتراکیت کا نظام آمرانہ (ڈکٹیٹرانہ) ہے۔ اس نظام میں عوام کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ یہ نظام ایک طبقے ایک پارٹی اور پھر اس پارٹی میں سے بھی چند ہوشیار قسم کے لوگوں کی آمریت کا قائل ہے۔

۴۔ اشتراکی نظام حکومت میں ریاست کو غیر محدود اختیار حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاتی۔ جس شخص پر جیسی پابندی چاہی بلا وجہ عائد کر دی۔ جس کو چاہا روپیہ پیسہ اور ذاتی جائداد سے محروم کر دیا۔ مگر اسلام ریاست کو مطلق العنان نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے اختیارات کو محدود کر دیتا ہے۔ اسلام کسی کی آزادی میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ حاکم کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ احکام خداوندی کا مطیع ہے۔ اگر حاکم کسی خلاف شرع بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں۔ اسلامی حکومت خدا اور عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہ شوریٰ کے مشورہ کی

پابند ہے۔ اسلام شخصی اور سیاسی آزادی کی پوری ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی ریاست ہمہ گیر ہونے کے باوصف کلیت پسند (TOTALITARIAN) اور تنقید و محاسبہ سے بالا نہیں بلکہ عوام اس سے محاسبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

سوال نمبر ۹۷:۔ اسلامی ریاست اور مغربی جمہوریت کا فرق دلائل سے واضح کیجئے۔

جواب:۔ اسلام اس بات کے قطعاً خلاف نہیں کہ حکومت کے معاملات عوام کی رائے سے طے ہونے چاہئیں اور امورِ سلطنت کو عوام کے نمائندوں کی مرضی کے مطابق انجام دینا چاہیئے بلکہ وہ اس ضمن میں نام نہاد جمہوریت نواز طبقہ سے بہت آگے ہے جو بزعم خویش بڑے جمہوریت پسند ہیں، مگر عملاً وہ آمرانہ نظام ہی کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اسلام جمہوریت کے اس پہلو کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ کوئی شخص بنیادی حقوق سے محروم نہ رہے اور ہر شخص کو حکومت کی جانب سے بنیادی حقوق کی ضمانت حاصل ہو۔ اسی طرح عوام کی مرضی کو معلوم کرنے اور اس کو مؤثر بنانے کے لئے جو تجربات کئے گئے ہیں اسلام اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ ان سے استفادہ کرتا اور انہیں اپنے حالات اور تقاضوں سے ہم رنگ اور ہم آہنگ بناتا ہے ان امور میں اسلام جمہوریت کا ہمنوا ہے اور اس ضمن میں دونوں کے درمیان کچھ اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جن امور میں اسلام اور مغربی جمہوریت کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام میں حاکمیتِ اعلیٰ (SOVERIEGNTY) کا منصب ذاتِ خداوندی کے ساتھ مختص ہے۔ انسان اس کائناتِ ارضی پر خدا کا خلیفہ ہے۔ اس کا کام قانون بنانا نہیں بلکہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو چلانا ہے۔ انسان اس قانون میں سرمو تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ اسلامی قانون کا مصدر و ماخذ کتاب و سنت ہیں۔ اصحاب الامر اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جن امور کے بارے

میں کتاب وسنت خاموش ہوں اور نفی واثبات کی صورت میں بھی ان کا کوئی ذکر نہ ہو تو عوام کے نمائندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اسلام کی روح اور اسلامی تعلیمات کے پیش نظر کوئی قانون بنائیں۔ عوام کے نمائندے یہ حق رکھتے ہیں کہ کتاب وسنت میں بعض امور پر صرف اجمالی و اصولی روشنی ڈالی گئی ہو اور تفصیلی بحث نہ کی گئی ہو ان کی تشریح و توضیح کریں۔ اسلامی حکومت کے پاس ایک تیار شدہ ضابطہ ہے جس کی روشنی میں سب معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اس کے اختیارات بڑی حد تک محدود ہیں۔

اس کے برخلاف مغربی جمہوریت میں انسان حاکمیت اعلیٰ پر قابض ہوتے ہیں۔ یہ اختیارات عوام کے نمائندے استعمال کرتے ہیں۔ یہ نمائندے قانون بھی بنا لیتے ہیں وہ کثرت رائے سے ہر قسم کا قانون بنا سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ مغربی جمہوریت کا مدار و انحصار تمام تر عوامی نمائندوں پر ہوتا ہے اور انہیں وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں

۲۔ مغربی جمہوریت میں پارٹی بازی اور کشمکش کا بازار گرم رہتا ہے۔ الیکشن سے پہلے جوڑ توڑ جھگڑے فساد اور ہنگامے بپا ہوتے ہیں۔ الیکشن کے بعد بھی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بغض و عداوت اور شکوک و شبہات کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلامی جمہوریت کا دامن اس قسم کے تنازعات سے پاک ہے۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ نیک کاموں میں تعاون کیا جائے، برائی میں کسی سے تعاون نہ ہو۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى — نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ — کرو۔ اور برائی اور گناہ میں ہرگز
وَالْعُدْوَانِ" (المائدہ۔ ۲) — تعاون نہ کرو۔

اسلام تمام افراد عامہ کے درمیان الفت و محبت اور تعاون و ہمدردی کی

فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظام مغربی جمہوریت سے بہتر ہے
۳۔ اسلامی جمہوریت میں اقتدار کے بھوکوں اور لالچی لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام ان لوگوں کو عہدے نہیں دینا چاہتا جو ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق عہدوں کے اہل وہ لوگ ہیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدہ پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو" (بخاری و مسلم)
ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا۔
"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس حکومت کے کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو" (ابو داؤد)
اس طرح اسلام ایک اخلاقی ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عہدہ داروں میں چند اخلاقی صفات کے پائے جانے کو ضروری قرار دیا ہے۔ جب تک وہ اعلیٰ اخلاقی صفات موجود نہ ہوں ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی جمہوریت ان سب باتوں سے بے نیاز ہے۔ اس کے یہاں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں وہاں ہر غرض پرست اور اقتدار کا بھوکا جو سیاسی ہتھکنڈوں سے الیکشن جیت سکے عوام کا نمائندہ بن سکتا ہے۔
۴۔ مغربی جمہوریت وطنی قومی اور جغرافیائی حد بندیوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر جگہ بغض و عداوت اور نفرت و حقارت کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں حسب و نسب، نسل و رنگ اور قوم و وطن کے اختلافات نے دنیا کے امن و سکون کو غارت کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے جس کا پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے اور کسی قوم و ملک تک محدود نہیں۔

اسلامی ریاست قوم و وطن اور رنگ و نسل کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ اس کے نزدیک سب کائنات ایک ملک اور پوری انسانیت ایک قوم ہے۔

فلاحی ریاست

سوال نمبر ۹۸ :۔ فلاحی ریاست سے کیا مراد ہے؟ دلائل سے ثابت کیجیے کہ اسلامی ریاست فلاحی ریاست ہے۔

جواب :۔ اسلامی ریاست کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک فلاحی ریاست (WELFARE STATE) ہے۔ فلاحی ریاست ایک قسم کی خادمِ خلق ریاست ہوتی ہے۔ جس کا مقصد صرف لوگوں سے ٹیکس وصول کرنا ملک میں امن و امان قائم کرنا اور ملکی دفاع ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذمہ داری لوگوں کی دینوی و اخروی فلاح و بہبود بھی ہوتی ہے۔ فلاحی ریاست طبقاتی اونچ نیچ کو دور کر کے لوگوں میں انسانی مساوات کی روح پیدا کرتی اور ان مشکلات کا ازالہ کرتی ہے جو سعی و جہد کی مساوات میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔ یہ ریاست مسلم و غیر مسلم شہریوں کی تمام ضروریات زندگی کی کفیل ہوتی ہے۔ اگر اسلامی ریاست کے کسی کونہ میں بھی فقر و فاقہ غربت و افلاس یا ظلم و جبر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو فلاحی ریاست فی الفور اسے ختم کرنے کے درپے ہوتی ہے۔ یہ ریاست اپنی تمام تر مساعی انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ اس ریاست کے پیش نظر صرف منفی تصورات ہی نہیں ہوتے بلکہ مشکلات کو دور کرنے کے لئے مثبت طرزِ عمل اختیار کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس کا فلاحی ریاست ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اسلام فقر و فاقہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مثبت

طریقوں سے افلاس و غربت کو حدودِ سلطنت سے مٹا دے۔ جس طرح دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ کفر و الحاد کو سرنگوں کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اسی طرح افلاس و غربت کو حدودِ مملکت میں پہنچنے نہ دینا بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "فقر انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے" آپؐ دعا فرمایا کرتے تھے۔

"اے اللہ مجھے کفر اور فقر و فاقہ سے محفوظ رکھ"

اسلام اشتراکیت کے برخلاف انسان کو انفرادی ملکیت کا حق دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو اجازت دیتا ہے کہ ذاتی جہد و سعی اور حلال ذرائع سے وہ جس قدر دولت چاہے کمائے۔ مگر اس اجازت کے ساتھ اسلام نے یہ تصور بھی دیا ہے کہ مال انسان کے پاس خدا کی امانت ہے۔ جسے صرف جائز مصارف میں ہی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ناجائز کاموں میں خرچ کرنا اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے فرد کو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرے گا تو خدا کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرنے والا ہوگا۔ ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صرف کرے۔ جو لوگ دولت جمع کرتے اور اسے انسانی فلاح و بہبود کے لئے خرچ نہیں کرتے نہ اس کو دوسروں کے حقوق نکالتے ہیں ان کو سخت سزا ملے گی۔ جب مال ایک خاص مقدار میں جمع ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا مال اغنیاء سے لے کر فقراء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"تُؤخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِھِمْ" (بخاری و مسلم)

ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کی جائے گی۔

اسلام میں زکوٰۃ کو ایک صدقہ نہیں بلکہ حق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ" (الذاریات۔۱۹)

ان کے مالوں میں مدد مانگنے والوں اور رزق سے محروم رہ جانے والوں کا بھی حق ہے

حکومت زکوٰۃ وصول کر کے حقداروں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

"خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" (التوبۃ۔۱۰۳)

ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے

اسلامی ریاست میں جو لوگ معذور و مجبور ہوں اور کمانے کے قابل نہ ہوں اسلامی ریاست ان تمام افراد کی کفالت کرتی اور ان کے لئے ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ" (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑ مرے اور ادا کرنے کے لئے اس نے مال نہ چھوڑا ہو تو اس کی ادائیگی میرے (اسلامی ریاست) ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے۔

"مَنْ تَرَكَ دَيْنًا أَوْ ضَيَاعًا فَلْيَأْتِنِي فَأَنَا مَوْلَاهُ" (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑے یا چھوٹے چھوٹے یتیم بچے چھوڑ جائے تو وہ میرے پاس آئے میں اس کا سرپرست ہوں۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

"مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَإِلَيْنَا" (بخاری و مسلم)

جو شخص مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے اور جو شخص بوجھ (قرض، یتیم بچے وغیرہ) چھوڑ جائے اس کے ذمہ دار ہم ہیں

ایک جلیل القدر صحابی بیان کرتے ہیں۔

"خدا کی قسم اگر جوانی میں ہم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا۔" (کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص۱۲۶)

یہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں جو آپ نے ایک بوڑھے ذمی کے حق میں فرمائے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حکومت جوانی کی عمر میں اس سے جزیہ وصول کرتی رہی ہو اور بڑھاپے میں اس کی ضروریات کی کفیل نہ ہو تو یہ انصاف سے بہت بعید ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے یا آفت زدہ اور مفلس ہو اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔ (کتاب الخراج ص۸۵)

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تمام آیات و احادیث کا خلاصہ علماء کے اس قول کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔

"علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اسی طرح وہ اس شخص کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ جس نے مرتے وقت قرض کی ادائیگی کے لیے مال نہ چھوڑا ہو۔ علاوہ ازیں وہ اس کے حین حیات اس کی کفالت کی ذمہ دار ہو گی جب کہ اس کا کوئی کفیل نہ ہو۔"

(زاد المعاد جلد اول ص۵)

امام ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں۔

"ہر بستی کے امراء کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی سے ان غرباء کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو خلیفہ وقت

امام ان ارباب دولت کو اس پر مجبور کر سکتا ہے۔ کم از کم اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے لئے ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں۔ مثلاً "روٹی، پہننے کے کپڑے جو گرمی و سردی سے بچانے کے لئے کافی ہوں۔ رہنے کے لئے ایک مکان جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔" (محلّی ابن حزم)

امام ابنِ حزم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مال پر ان کے غریب بھائیوں کی ضروریات کو پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ اگر اہلِ ثروت کے حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے وہاں کے لوگ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے روز اس کی باز پرس کرے گا اور انہیں اس کوتاہی کی سزا دے گا۔" (محلّی ابن حزم ص۱۵۷)

اسلامی ریاست کی یہ کفالت صرف علمی دلائل ہی سے ثابت نہیں بلکہ قرنِ اول کے مسلمانوں نے عملی طور پر بھی اس نظام کو قائم کیا اور دنیا کی اولین فلاحی اور خادمِ خلق ریاست کی تشکیل کی تھی۔ دورِ حاضر کے مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی رقمطراز ہیں۔

"اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے زیادہ آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لئے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا۔ اس لئے ہر شخص کے لئے اسی قدر آٹا مقرر تھا۔ غرباء و مساکین کیلئے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کی تنخواہ مقرر کر دی جائے۔"

وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے غرباء و مساکین کی نگہداشت کا بے نظیر نظام قائم کیا۔ اس کے برخلاف سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت میں ایسے لوگوں کی کفالت کی۔

کوئی ضمانت نہیں۔ وہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول رائج ہے۔ گرے پڑے اور نادار طبقہ کی حفاظت و نگہداشت کیلئے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جاتے اس کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ اس کے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے۔ فقراء و مساکین کیلئے وہاں سعی و جہد کا بھی کوئی امکان نہیں اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ جو امیر ہے وہ سدا امیر رہے اور جو غریب ہو وہ ہمیشہ غربت کے شکنجہ میں پھنسا رہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نفع اندوزی اور ظلم و تعدی کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ غیر مسادی معاشی جد وجہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سونے کی تجوریاں پڑی ہیں اور دوسری طرف لوگ نانِ جویں کو ترس رہے ہیں۔ اسلامی نظامِ حکومت ایک عادلانہ معاشی نظام پر عمل کرتی ہے۔ یہ نظام امیر و غریب سب کو پھلنے پھولنے کے مساوی مواقع مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر گرتوں کو تھامتا اور معاشی طور پر پسماندہ لوگوں کو سہارا دیتا ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت غریب طبقہ کی کفالت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو اس کی آزادی اور انفرادیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ لوگوں کو انفرادی ملکیت سے محروم کرنا اسلامی عدل و انصاف سے بعید ہے۔ اسلام مالکانہ حقوق اور سعی و جہد کی آزادی دینے کے بعد توازن اور انصاف کو قائم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اشتراکی نظام عوام کے لئے روٹی کپڑا مہیا کرتا ہے لیکن ان کو شخصی آزادی اور انفرادی ملکیت سے محروم کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں بعض ممالک فلاحی مملکت کے تصور کو اپنانے کے دعویدار ہیں۔ مگر ان میں اور اسلامی نظامِ حکومت میں بڑا فرق ہے۔ فلاحی مملکت ہونے کے مدعی ممالک عوام کی جو خدمت کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی بیداری اور مطالبات کی شدت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ برسرِ اقتدار

پارٹی اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے اور الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ مساعی صرف اس لیے انجام دی جاتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مادی فائدہ حاصل کیا جائے۔ اور اپنے اقتدار کو قائم رکھا جائے۔

بخلاف ازیں اسلامی ریاست عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا فرض خیال کرتی ہے اس کا مقصد وجود ہی عوام کو سہولت بہم پہنچانا اور ہر طرح کی حفاظت و نگہداشت کرنا ہے۔ اسلامی ریاست مطالبات اور احتجاج کے ڈر سے یہ حقوق ادا نہیں کرتی بلکہ اس کے یہاں یہ بنیادی اصول ہے۔ جس کو ہر قیمت پر نبھانا اس پر فرض ہے۔ اسلامی حکومت کسی جبر کے تحت یہ کام نہیں کرتی بلکہ دلی تعاون اور عبادت کے جذبہ کے ساتھ اسے انجام دیتی ہے۔ یہاں صرف معیارِ زندگی ہی کو اونچا نہیں کیا جاتا بلکہ اخلاقی اقدار کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے بہتر ہے۔

معلّم اور داعی ریاست

سوال نمبر ۹۹ :۔ اسلامی ریاست میں تعلیم و تربیت، دعوت و ارشاد اور اخلاقِ حسنہ کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

جواب :۔ **تبلیغ اور دینِ اسلام** اسلام صرف معاشی کفالت کا ہی ذمہ دار نہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت بھی اس کے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اسلامی ریاست تمام شہریوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنی، پوری دنیا کے سامنے حق کو پیش کرنی اور اسلام کے جھنڈے کو بلند رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ" (ابن ماجہ)
علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ دعوت وتبلیغ ہے۔ یعنی جو سچائی اس کو خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا اس لئے اس کو جن صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اعلان ودعوت میں جو تکلیف بھی سامنے آئے اس کو راحت جاننا۔ جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا۔ حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال ومنال، اہل وعیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اس کا دائرہ جملہ اقوامِ عالم اور جمیع ازمنہ و امکنہ کو محیط ہے۔ اس لئے ہر دور کے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن تبلیغ اسلام کے لئے تیار رہیں۔ اور جس مذہب کو انہوں نے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے دوسروں کو بھی اس سے روشناسی کرائیں۔ قرآن کریم میں فرمایا :-

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (آل عمران - ۱۱)
تم وہ بہترین جماعت ہو جسے لوگوں کے (فائدے کے لئے) پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے اور اللہ پر

ایمان رکھتے ہو۔

سب امت پر عمومی حیثیت سے دعوت وارشاد کو فرض ٹھہرایا۔ پھر امت میں ایک ایسے گروہ کے وجود کو ضروری قرار دیا۔ جو اپنی زندگی کو اسی کام کے لئے وقف کر دیں۔

قرآن میں فرمایا:

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (آل عمران ۔ ۱۰۴)	تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیئے جو بھلائی کی دعوت دے نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

اس آیت میں امت کے ذمہ شہادتِ حق کا وہی فریضہ عائد ہوتا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا۔

"لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" (الحج ۔ ۷۸)	تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو۔ اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ بنو۔

اراکین حکومت کے بارے میں فرمایا:

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" (سورۃ الحج)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے باز رکھیں گے۔

ان آیات میں واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و اصلاح اور تبلیغ وارشاد کی بھی ذمہ دار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے اس کے مبلغ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے جن کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ اب آپ

کے بعد دین کی اشاعت و تجدید کے لئے کوئی نیا نبی مبعوث ہو کر نہیں آئے گا۔ بلکہ تاقیام قیامت اصحاب علم مسلمان خطۂ ارضی کے دور افتادہ کونوں تک اس کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے۔ دنیوی مشاغل میں منہمک ہو کر جب دینی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو ان کو گرمانے اور از سر نو زندہ کرنے کے لئے بھی تبلیغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنا بریں مسلم و غیر مسلم دونوں کو دینی احکام سے روشناس کرانے کے لئے ہر دور میں تبلیغ کی شدید ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کو ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیام الٰہی کو لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے فریضۂ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔

قرآن میں فرمایا:۔

"یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (سورۃ المائدہ۔۱۰)	اے رسول تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں دیگر فرائض و مناصب تفویض کئے گئے تھے وہاں معلم اعظم کا عہدۂ جلیلہ بھی عطا ہوا۔ جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک مسجد تعمیر کی جو بعد میں مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ مسجد جہاں عبادت گاہ تھی وہاں اسے ایک مکتب کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ مسجد کے آگے ایک چھوٹا سا سائبان تھا جسے صُفّہ کہتے تھے۔ اسلام کے اولین طلبہ جن کو اصحاب صُفّہ کہا جاتا ہے اسی مکتب میں زیر تربیت تھے۔ اصحاب صُفّہ چند مفلس صحابہ تھے جو شمع نبوی کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ اِن کا مقصدِ وحید صرف

تحصیل علم تھا۔ ابوہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور کاتب تار حافظ حدیث اصحاب صُفّہ ہی میں شامل تھے۔ فضیلتِ علم ہی کا نتیجہ تھا کہ آنحضورؐ نے اشاعتِ علم کی جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائی آغازِ اسلام میں صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپؐ کی کوشش سے لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہوا۔ جنگِ بدر میں جب کفار کے ستر آدمی گرفتار ہوکر آئے تو آپؐ نے ان قیدیوں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا جو دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے اشاعتِ علم کو صد درجہ تقویت حاصل ہوئی تھی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عبرانی زبان سیکھی تاکہ بین الاقوامی معاملات میں آسانی رہے۔ تعلیم کو پھیلانے کے لئے آپؐ مختلف مقامات پر تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجا کرتے تھے۔ مدینہ کے باہر کے لوگوں کے لئے آپؐ نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے ذہین افراد کو مدینہ بھیجیں جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جاکر اپنے اپنے علاقہ میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان میں سے سمجھ دار لوگوں کو آپؐ ان کی تعلیم پر مامور کرتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر کرتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ جب آپؐ نے عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں یہ نصیحت فرمائی۔

"حق پر قائم رہیں اور لوگوں کو بھلائی کا حکم اور بھلائی کی بشارت دیں۔ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان کو با سمجھ بنائیں۔ لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو چھونے سے روکیں۔ لوگوں سے نرم سلوک روا رکھیں تاکہ لوگوں میں دین کا فہم حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو" (سیرت ابن ہشام جلد ۲ صـ ۲۴۱)

علم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا تقاضا ہے کہ اسلام نے معاشرے کے ہر شعبہ میں علم ہی کو وجہِ فضیلت اور عزت و وقار کے لئے معیار و مدار مقرر کیا ہے۔ امامت و خطابت سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے وہ قرآن و

حدیث کا علم ہے۔ آنحضورؐ نے اسلامی مملکت کے ہر کونے میں معلم مقرر کر دیئے تھے جو لوگوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلہ محلہ اور گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا اور دوسری جانب اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے اہل علم اور صاحب فہم و ادراک کارکن میسر آتے گئے جو ہر طرح قیادت و سیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔

تاریخ اسلام کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو قدر و رفعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مسلمان تاریخ کے ہر دور میں علم کی سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ تمام شہریوں کیلئے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔ نظام تعلیم میں علوم دینیہ کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مفید علوم و فنون کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ البتہ بے مقصد علوم سیکھنے میں اپنا وقت اور مال ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا معاوضہ کبھی وصول نہیں کیا۔ اسلامی حکومتوں میں فیس وصول کرنے کا رواج نہ تھا۔ ہر قسم کے علوم بلا فیس لوگوں کو پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیم کے پہلو بہ پہلو اسلامی ریاست اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ یہ ریاست صرف مسلم شہریوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کرتی بلکہ پوری کائنات تک اسلامی تعلیمات کو پہنچاتی ہے۔

مذکورہ صدر بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک معلم کی طرح اپنے شہریوں کی تربیت کرتی اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پہنچاتی ہے۔ اس حیثیت سے یہ ریاست ایک طرف تو لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو اونچا کرتی ہے اور دوسری طرف اسلام کی عالمگیر دعوت کو عام کرتی ہے۔ اس کی دعوت ہمہ گیر اور غیر محدود ہے۔ یہ کسی قوم و ملک اور خطہ ارضی تک محدود نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے ہے۔ اس اعتبار سے یہ ریاست منفرد اور اپنی مثال آپ ہے۔

اسلامی تصورِ قومیت

سوال نمبر ۱۰۱:۔ نظریہ قومیت سے کیا مراد ہے؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو تاریخ میں قومیت کو جنم دیتے رہے ہیں؟

جواب:۔ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں تعاون و ہمدردی پائی جائے۔ تعاون واشتراک کا جذبہ ہی قومیت کی اساس ہے۔ قوم انسانوں کے گروہ کا نام ہے جو مل جل کر رہنے کا خواہاں ہو اور اجتماعی وحدت نے جس کی شیرازہ بندی کر دی ہو اس گروہ کے افراد میں مل جل کر رہنے کا جو احساس پایا جاتا ہے اسی کا نام قومیت ہے۔ اس احساس سے جب جانبداری اور حمایت کا جذبہ ابھرتا ہے اسے عصبیت یا تعصب کہتے ہیں۔ اسی تعصب کے نتیجہ میں قوم اپنے افراد سے محبت کرتی ہے۔ اور دوسروں کو اجنبی اور بیگانہ تصور کرتی ہے۔ اس جذبہ میں جب شدت وحدت کے آثار رونما ہوتے ہیں تو اس سے دوسری قوموں کے خلاف نفرت وحقارت کے احساسات ابھرنے لگتے ہیں۔ اسی کے زیرِ اثر لوگ اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں۔ قطع نظر اس سے وہ حق پہ ہو یا باطل پر۔ نظریۂ قومیت کو دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں نیشنلزم (NATIONALISM) کہتے ہیں۔

قومیت کے عوامل | قومیت کو پیدا کرنے والے عوامل یوں تو بہت سے رہے ہیں مگران میں سے اہم یہ ہیں۔

ا۔ نسل:۔ ایک نسل کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ ان کی قومیت کی بنیاد وحدتِ نسل ہے۔ اس کی مثال یہودیت اور جرمنی کا نازی ازم ہے ان دونوں تحریکوں کی بنیاد نسل پر رکھی گئی ہے یہودی مذہب دراصل ایک نسلی مذہب ہے جو بنی اسرائیل کی

نسل میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ نازی ازم جرمن قومیت کا دعویٰ دار ہے۔ اسلام میں حسب و نسب اور نسل کی بنیاد پر کوئی قوم نہیں بنتی۔ اس کی نگاہ میں سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور سب کی نسل ایک ہے۔ اسلام ایسی نسلی تفریق کا قائل نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نسلی تفریق اور فخر بالآباء کو مٹانے آیا ہوں۔

۲۔ رنگ:۔ کسی خاص رنگ مثلاً کالے یا گورے کو بھی قومیت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ایک رنگ کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنے میں شامل نہیں کرتے۔ افریقہ میں گورے اور کالے کا امتیاز اور امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں حبشی اور غیر حبشی کی تفریق اسی تصور کی یادگار ہے۔ اسلام کسی خاص رنگ کو وجہ امتیاز نہیں ٹھہراتا اس کے نزدیک کالے گورے اور عربی عجمی میں رنگ کی بنا پر کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا عظمت و فضیلت کا معیار سیرت و کردار اور افعال و اعمال ہیں۔

۳۔ زبان:۔ ایک زبان بولنے والوں کو ایک قوم تصور کیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ یہ زبان نہ بولتے ہوں وہ اس سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ زبان صرف اظہار مافی الضمیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اسلام اسے قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ دورِ حاضر میں عرب قومیت کی تحریک زبان کے اتحاد پر ہی کھڑی کی گئی ہے۔

۴۔ معاشی اغراض اور نظام حکومت:۔ معاشی اغراض و مقاصد کی یگانگت اور ایک ہی نظام حکومت کے زیر سایہ رہنے سے بعض اوقات قومیت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کے معاشی مسائل یکساں نوعیت کے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایک قوم کے افراد تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک حکومت میں رہنے والے بھی ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام اس چیز کو بھی قومیت کی اساس قرار نہیں دیتا اس لئے کہ معاشی مسائل اور نظام حکومت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کسی ناپائیدار چیز کو حکومت کی بنیاد ٹھہرانا درست نہیں۔

۵۔ وطن:۔ ایک خاص وطن میں بود و باش رکھنے کو بھی قومیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایک ایسے خطۂ ارضی میں رہتے ہیں جن کو جغرافیائی حدود نے ایک علیحدہ ملک کی صورت دے دی ہو وہ ایک قوم ہیں۔ جو لوگ اس محدود رقبہ میں آباد نہیں وہ اس کی قومیت سے خارج ہیں۔ قومیت کے تمام عوامل میں سے آج وطن کا چرچا سب سے زیادہ ہے۔ وطنیت کا جذبہ بے جا حمایت و عصبیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جن کو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں قومیت کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا رہا ہے مگر اسلام ان میں کسی کو بھی قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا بالفرض اگر یہ تمام عوامل یکجا ہو جائیں تو بھی ان سے قومیت کی تشکیل نہیں ہوتی۔

سوال نمبر ۱۰۱:۔ جن عوامل کو آج قومیت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے دلائل سے ثابت کیجئے کہ وہ قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔

جواب:۔ جن امور کو قومیت کے عوامل قرار دیا گیا ہے درحقیقت ان میں سے کوئی بھی عامل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ان عوامل سے کوئی انسانی ضرورت پوری نہیں ہوتی بلکہ ان سے انسانیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ جاتی ہے جس کا نتیجہ بے جا تعصب و حمایت اور ظلم و تعدی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ان کو قومیت کی اساس قرار دینا عقل و فطرت کے بھی منافی ہے۔ اتحاد نسل سے کسی قوم کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ خون کا رشتہ بیشک اہم ہوتا ہے مگر چند نسلوں کے بعد وہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ کسی نسل کے خالص ہونے کی کیا ضمانت ہے؟ اور اس کی کیا دلیل ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی؟ علاوہ ازیں اگر نسل ہی کا اعتبار ہے تو آدم و حوا کو اس کا نقطۂ آغاز کیوں نہ بنایا جائے؟ جب کہ سب انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اسلام رشتۂ رحم کو غیر اہم نہیں سمجھتا۔ اس میں صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے اور

قطع رحم سے روکا گیا ہے۔ مگر اسلام اس رشتہ کو قومیت اور سیاسی مرکزیت کے لئے ایک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ اگر نسلی اتحاد قومیت کی تشکیل کے لئے ایک بنیادی عامل ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور نوح علیہ السلام کے بیٹے کو ان سے الگ نہ کیا جاسکتا۔

اسی طرح رنگ کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق بھی ایک غیر فطری خلافِ عقل اور بعید از انصاف فعل ہے۔ آب و ہوا اور طرزِ بود و باش کے اختلاف سے بھی رنگ کا اختلاف ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نسلی توارث سے بھی ایسے پیدا ہونے کا امکان ہے ان میں سے کوئی بات بھی انسانوں کے سیاسی و معاشرتی مسائل میں کوئی دخل نہیں رکھتی بلکہ اس سے حسد و بغض اور عداوت کینہ سوزی کے جذبات ابھرتے ہیں جس سے فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوتا اور خدا کی زمین خون ریزی و سفاکی کے واقعات سے لالہ زار بن جاتی ہے۔ جن ممالک میں رنگ کے اختلاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہاں کبھی امن و چین کی فضا قائم نہیں ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ اگر ایک حبشی غلام کو بھی تم پر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔"

زبان کے اتحاد کو بھی قومیت کی تشکیل سے کوئی تعلق نہیں۔ زبان صرف اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے، قومیت کی اساس نہیں ہے۔ زبان کے اتحاد سے زیادہ اہمیت تو افکار و آراء اور جذبات و احساسات کی یکرنگی و ہم آہنگی کو حاصل ہے۔ زبان صرف ان کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے عربی زبان نے امرؤ القیس جیسے بلند پایہ شاعر کو جنم دیا جو اپنے کمالِ فن کی وجہ سے ملک الشعراء کہلاتا تھا۔ چونکہ اس نے جن شاعرانہ خیالات کا اظہار کیا وہ باطل اور لغو تھے اس لئے افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ وَ قَائِدُهُمْ اِلَی النَّارِ" (سب سے بڑا شاعر گروہ دوزخیوں کا امام) کا لقب دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی عربی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ ان کے

بیحد مداح تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل اہمیت صحت فکر و نظر کو حاصل ہے اور زبان صرف ایک ذریعہ اظہار ہے۔ ورنہ امرؤ القیس اور حضرت حسان دونوں کی زبان عربی تھی۔

اشتراک وطن کو بھی قومیت کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وطن ہر کسی کو عزیز ہوتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جس سے انبیاءؑ تک بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ آیا وطن کو قومیت کی تشکیل کے لئے بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ قومیت کی تشکیل افکار و نظریات اور عقائد کے اتحاد و اشتراک پر کی جاتی ہے وطن کی بنیاد پر نہیں۔ نظریات وہ چیز ہیں جن پر وطن کو بھی قربان کر دیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہؓ نے ایمان کی خاطر وطن کو ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان عالم وجود میں آیا۔ لاکھوں مسلمان اپنے ایمان کو بچانے کے لئے بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اگر غور کیا جائے تو جس زمین پر ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ چند گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر اسے پھیلا کر پورے ملک کو محبت کا مرکز بنایا جا سکتا ہے۔ تو پھر ملک سے آگے بڑھ کر اس محبت کو ساری دنیا تک کیوں وسیع نہ کر دیا جائے۔ دین اسلام وطن کی محبت کو مٹاتا نہیں لیکن اتحاد اور وفاداری کی اصل بنیاد وطن کی بجائے اصول و نظریات کے اتحاد اور دین کو قرار دیتا ہے۔ دین ایسی اہم چیز ہے کہ اس کے لئے وطن کو خیرباد بھی کہا جا سکتا ہے علامہ اقبالؒ نے صحیح فرمایا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جانا اور وہاں اسلامی ریاست کی تشکیل کرنا قومی وطنیت کے نظریہ پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ تمام عوامل عقلی اور اصولی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں پا سکتے۔ ان کے اجتماع سے جو قوم بنتی ہے وہ غیر فطری ہے اس میں الفت و محبت کی بجائے تعصب تنگ نظری اور حسد و عداوت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس میں انسانوں کے مسائل کو حق و باطل کی بجائے ایک مخصوص قومی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ وہ انسانوں

کو جوڑتی نہیں توڑتی ہے۔ اس کے وجود سے تنگ نظری اور تعصب کی آگ بھڑکتی ہے۔
اور یہ دنیا ایک جہنم بن جاتی ہے۔

سوال نمبر ۱۰۲:۔ وہ کونسے امور و اسباب ہیں جو اسلامی قومیت کو جنم دیتے ہیں! تفصیلاً بیان کیجئے؟

جواب: ۔ اسلام کا نظریۂ قومیت سب سے الگ ہے یہ رنگ و نسل اور وطن و زبان میں سے کسی کو بھی قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ اسلام ایک انقلابی پیغام کا علم بردار ہے وہ قومیت کی بنیاد اسلام پر رکھتا ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر اور جامع نظریۂ حیات کا داعی ہے جو شخص اس دعوت پر لبیک کہتا ہے وہ اس کی قومیت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور جو اس سے انکار کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

اسلام رنگ و نسل اور قوم و زبان کی غیر فطری تقسیم کو مٹانے کے لئے آیا ہے وہ خالص عقلی بنیاد پر ایک قوم کی تعمیر کرتا ہے وہ انسانوں کو ارضی و مادی بنیاد پر تقسیم نہیں کرتا بلکہ روحانی و جوہری امتیاز کا قائل ہے۔ اسلام خدا کی اطاعت و عبادت نفس کی پاکیزگی، عمل صالح اور تقویٰ کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس دعوت کو قبول کرنے اور اس سے انکار کرنے والوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر کفر و اسلام دو قوموں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان وجہ فرق و امتیاز عقیدہ و اور عمل ہے، نسل و نسب یا قوم و زبان نہیں۔ ایک باپ کے دو بیٹے کفر و اسلام کی بنا د پر جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ دو بالکل اجنبی آدمی جن کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو اسلام کے رشتۂ اتحاد کی بنا پر ایک شیرازہ میں منسلک ہو سکتے ہیں یہاں وطن کا اختلاف بھی اتحاد سے روک نہیں سکتا۔ بلال حبشی رضؓ اور صہیب رومی رضؓ اختلاف نسل وطن کے باوجود ایک ہی قوم کے فرد بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے

کہ ایک شہر ایک محلہ اور ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک سوڈانی رشتۂ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک پاکستانی کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کے اختلاف کو بھی اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہاں ظاہری رنگ کا اعتبار نہیں بلکہ باطن کا رنگ معتبر ہے۔ باطنی رنگ اللہ کا رنگ ہے اس لئے وہ اصلی اور حقیقی رنگ ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" (البقرہ۔ ۱۳۸)
اللہ کا رنگ اختیار کرو اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

ایک گورا اور ایک کالا شخص اسلام کے رشتۂ اتحاد کے باعث ایک ہی قوم کے فرد ہو سکتے ہیں۔ اور کفر کی بنا پر دو گورے آدمی الگ الگ قومیت کے فرد ہوں گے۔ اسلام زبان کے اختلاف کو بھی وجہ تفریق قرار نہیں دیتا۔ وہ زبان کے اختلاف سے دل کے اختلاف کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ دو آدمیوں کی زبان مختلف ہو لیکن دونوں کے دل ایک ہوں تو وہ دونوں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ دو آدمی جن کی بولی ایک ہو لیکن دل مختلف ہوں دونوں الگ الگ قوم کے فرد ہوں گے۔

معاشی اور سیاسی نظام کو بھی اسلام قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ دو شخصوں کا ذریعۂ معاش ایک ہو۔ مگر کفر و اسلام کے اختلاف کی بنا پر وہ ایک قوم کے فرد نہ ہوں۔ اسی طرح دو مختلف نظاموں کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھی دو شخص ایک ہی قومیت (اسلام) کے فرد ہو سکتے ہیں۔ اسلام کے یہاں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ زر و مال نہیں بلکہ دولت ایمان ہے۔ یہاں سوال انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور خدا سے عہد وفا باندھ چکے ہیں وہ سب ایک ہی قوم کے فرد ہیں خواہ وہ کہیں رہتے ہوں اور کسی حکومت کی اطاعت کرتے ہوں

جو خدا کی حکومت کے نافرمان ہیں وہ مسلمانوں سے ایک الگ قوم ہیں خواہ کسی مملکت کے زیر سایہ رہتے ہوں۔

اسلام نے قومیت کی جو حد بندی کی ہے وہ جغرافیائی اور مادی حد بندی نہیں اس نے قومیت کو ایک عقلی دائرہ میں محدود و تصور کیا ہے۔ جس کا مرکز کلمہ طیبہ ہے۔ عداوت و محبت کا انحصار اسی ایک کلمہ پر ہے۔ اس کا اقرار بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ میں باندھ دیتا ہے۔ اور اسی کا انکار انہیں جدا جدا کر دیتا ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں ملتِ اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان مختلف ممالک میں رہتے ہوں تو بھی انہیں خالص وطنی قومیت کے مقابلہ میں اسلام کی نظریاتی قومیت کی حمایت کرنا چاہیئے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کرۂ ارض کے سب مسلم ممالک مل کر اپنی ایک دولتِ مشترکہ قائم کریں۔ دورِ حاضر میں پاکستان اسلامی قومیت کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کے قیام میں ہندوستان کے سب مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا ہے۔ یہ جغرافیائی وحدت یا نسل و زبان اور رنگ کے اتحاد کی بنا پر عالم وجود میں نہیں آیا۔ اس میں جغرافیائی وحدت کا کوئی نشان ہے نہ اتحادِ زبان و بیان کا کوئی امکان۔ صرف دین و ایمان اور نظریات کی وحدت نے دو دُور افتادہ ملکوں کو جوڑ رکھا ہے۔ اسی کو قائم کرنے کے لئے یہ ملک عالم وجود میں آیا اس کا تقدس ہماری نگاہ میں صرف اس امر سے وابستہ ہے کہ یہ اسلامی نظریات کا داعیہ لے کر اٹھا ہے۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

سوال نمبر ۱۰۲:- اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کے اصول بیان کیجیے؟

جواب:- جو ریاست اسلامی نظریۂ قومیت پر ایمان رکھتی ہے اس کی خارجہ پالیسی

کے بنیادی اصول حسب ذیل ہے۔

۱۔ **دعوت اسلام کی تبلیغ** اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ ریاست خدا کی شریعت کی داعی اور مبلغ ہے۔ قرآن نے اس کو امت وسط" قرار دیا اور "شہادت حق" کو اس کا فریضہ ٹھہرایا ہے۔ یہ ریاست اپنے قول وعمل اور طریق کار سے دین حق کی شہادت دینی اور اس کی صداقت کو اقوام عالم پر روشن کرتی ہے۔ یہ ریاست کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہیں کر سکتی جس سے اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے۔

۲۔ **عوام کی فلاح وبہبود** اسلامی حکومت رعایا کے مفاد کا ہر طرح خیال رکھتی ہے وہ عوام کی صلاح وفلاح کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ اسلامی حکومت ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے جس کا مطمح نظر ہی لوگوں کا آرام وآسائش، ان سے حقیقی خیر خواہی وہمدردی اور ان کے حقوق کے لئے جدوجہد ہے۔ یہ ملک میں امن وامان قائم کرتی ہے۔ فتنہ وفساد کو دور کرتی ہے۔ اور ملک میں سکون واطمینان کی فضا پیدا کرتی ہے۔ اسلام وطن کی محبت کو علامت ایمان قرار دیتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ حق وناحق ہر حال میں وطن کی طرفداری کی جائے۔ اسلام حق کی صورت میں تعاون کا حکم دیتا ہے اور ناحق ہونے کی حالت میں مخالفت کو فرض قرار دیتا ہے۔ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد سمجھ میں آتی ہے۔ اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "اس کی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو"

۳۔ **دولت مشترکہ کا قیام** اسلام کرۂ ارضی کے مسلمانوں کو ایک امت قرار دیتا ہے اس لئے اسلامی ریاست کو دیگر مسلم ممالک کے ساتھ تعاون واشتراک کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ تمام مسلم ممالک کو چاہیئے کہ باہمی تعاون واتحاد سے ایک دولت مشترکہ قائم کریں۔ مسلم ریاستوں کو باہم محبت، خیر سگالی، اتحاد واتفاق اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔ خارجی پالیسی

کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ جو مسلمان غیروں کے غلام ہوں ان کو غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ مسلمان صرف خدا کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے کسی غیر کا غلام نہیں رہ سکتا۔ کرۂ ارضی پر اگر ایک مسلم بھی غلامی میں گرفتار ہے تو اسے آزاد کرانا سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسلامی فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو فدیہ دے کر اسے رہا کرانا مغرب میں بسنے والے مسلمانوں پر فرض ہے۔ خواہ اس کے لئے سب مسلمانوں کا مال دینا پڑے۔ جب ایک عورت کا چھڑانا اتنا ضروری ہے تو اسلامی ممالک کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانا کس قدر اہم ہوگا۔

قرآن میں فرمایا:۔

"إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ" (المومنون۔ ۵۲)

تمہاری یہ امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس مجھ سے ڈرو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا" (آل عمران۔ ۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے مسلمانوں کا ایک امت ہونا واضح ہوتا ہے۔

۴۔ **قیام امن** اسلام امن کا پیام لیکر آیا ہے یہ امن عالم کا علمبردار ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔ قرآن خونریزی کو عظیم جرم قرار دیتا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا" (المائدہ۔ ۳۲)

جس نے قصاص لینے یا ملک میں فساد پھیلانے والوں کو سزا دینے کے علاوہ کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کا قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی گویا اس نے

تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

قرآن میں دوسری جگہ فرمایا:۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا" (المائدہ۔ ۸)

ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ کر دے کہ تم عدل کرنا چھوڑ دو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قیام امن کا خواہاں ہے وہ انسانی زندگی کو دولتِ امن سے مالا مال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام صرف قیام امن کی تاکید ہی نہیں کرتا بلکہ ان اسباب کی نشاندہی کرتا ہے جو قیام امن کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فتنہ و فساد کے ذرائع و وسائل ختم کرنے پر ہی حقیقی امن و سکون قائم ہو سکتا ہے۔

قرآن میں فرمایا۔

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ" (البقرہ۔ ۱۹۳)

اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے اور دین خالص اللہ کیلئے نہ ہو جائے۔ اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیئے۔

۵۔ انسانی مساوات

اسلام جغرافیائی حدود کی اساس پر انسانوں کو تقسیم نہیں کرتا وہ ایک بین الاقوامی برادری قائم کرنے کا متمنی ہے جو ایک قانون کی پیروی کرنے والی اور ایک مرکز سے وابستہ ہو۔ اسلام ایک ایسی برادری قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نسب و نسل، زبان و بیان، کالے و گورے، اور عربی و عجمی کا کوئی امتیاز نہ ہو پوری انسانی برادری ایک خاندان کی طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ اگر اس میں کوئی فرق و امتیاز پایا جاتا ہو تو صرف ایمان و تقوی کی بنیاد پر۔ ایمان و تقوی ایک ایسی چیز ہے جو کسی کی میراث نہیں۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ پوری انسانیت اس میں مساوی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر شخص محنت و

خلوص سے اس دولت کو پا سکتا ہے۔ حدیثِ نبویؐ میں سب کائنات کو خدا کا کنبہ کہا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ" (بیہقی)

ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بہت محبت کرتا ہے جو اس کے کنبہ سے نیک سلوک روا رکھتا ہے۔

۶۔ ایفاءِ عہد ایفاءِ عہد بھی اسلامی ریاست کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلام معاہدہ کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (المائدہ۔ ۱)

اے ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو۔

معاہدہ شکنی کی اس صورت میں اجازت ہے جب دوسرا فریق بھی اس کی خلاف ورزی کر رہا ہو۔ جب معاہدہ توڑنا ہو تو برملا دشمن سے کہہ دیا جائے کہ اب معاہدہ کی پابندی نہیں ہو گی۔

"فَاَتِمُّوْا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ اِلٰی مُدَّتِھِمْ" (التوبۃ۔ ۴)

پس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک پورا کرو۔

۷۔ انتقام کی اجازت بین الاقوامی معاملات میں انتقام لینے کی اجازت ہے مگر انتقام میں ظلم و تعدی کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ظلم اتنا ہی کیا جائے جتنا کیا گیا ہو۔ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ انتقام سرے سے لیا ہی نہ جائے۔ بلکہ درگذر سے کام لے کر معاف کر دیا جائے۔

قرآن میں فرمایا:۔

"وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا" (الشوریٰ۔ ۴۰)

برائی کا بدلہ تو بس اس کے برابر برائی ہی ہو سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

"فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ" (البقرہ۔۱۹۴)

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر زیادتی کر کے اس کا بدلہ لے سکتے ہو۔

نیز فرمایا:۔

"وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ" (النحل۔۱۲۶)

اور اگر کسی کو سزا دو تو چاہیئے کہ اتنی ہی دو جتنی تمہیں دی گئی ہو۔ اور اگر تم نے صبر کیا تو بیشک وہ صبر کرنیوالوں کیلئے بہتر ہے۔

مذکورہ صدر آیات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت اگرچہ دوسرے ممالک سے انتقام لینے کی مجاز ہے مگر عفو و درگزر کا مقام بلاشبہ انتقام سے بلند تر ہے۔ تاہم واقعات و حقائق ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس موقع پر انتقام لیا جائے اور کہاں عفو و درگزر کو ترجیح دی جائے۔

اسلام کے تقاضے

اسلام کا تصورِ دین

سوال نمبر ۴۔۱:۔ مذہب کے بارے میں آجکل کونسے تصورات پائے جاتے ہیں؟ کونسا تصور قابلِ ترجیح ہے اور کیوں؟

جواب:۔ مذہب کے بارے میں آجکل تین تصورات پائے جاتے ہیں۔

ا۔ رہبانیت مذہب کے بارے میں ایک تصور تو یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے ایک قید خانہ اور دارالعذاب ہے۔ انسان اس سے جتنی جلدی نجات حاصل کر سکے بہتر ہے۔ انسانی فلاح

جسم کے پنجرہ میں بند ہے۔ وہ جب تک اس پنجرہ کو توڑ پھوڑ کر آزادی حاصل نہ کرلے اپنے مقصود کو نہیں پا سکتا۔ انسان اسی صورت میں قرب خداوندی کو حاصل کر سکتا ہے۔ کہ وہ دنیوی لذت اور عیش و مسرت سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں، پہاڑوں، غاروں اور انسانی آبادی سے دُور دراز صحراؤں میں جا کر محو عبادت رہے۔ انسانی جسم کو جتنا الم و رنج پہنچایا جاتے رہیں گا اور بیا سارہ کھا جلتے، اس کی جائز خواہشات کو پورا نہ کیا جائے، روح کو اسی قدر لطافت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس مذہبی طرز فکر کا نام "رہبانیت" یا "یوگ" ہے۔

۲۔ ناقص و بیزاری مذہب کے بارے میں دوسرا تصور یہ ہے کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے۔ جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے۔ انسان روحانی عظمت کے حصول کیلئے خدا کی عبادت کرے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صدقات و خیرات دے، مگر اجتماعی زندگی میں اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان اجتماعی معاملات میں بالکل آزاد ہے۔ جیسے چاہے کرے۔ مذہب اس بارے میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ مذہب بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے۔ اسے "ناقص تدین" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تعلیمیافتہ طبقہ میں عیسائیت کے زیر اثر یہ نظریہ عام طور سے مقبول ہے۔

۳۔ اسلام تیسرا نظریہ یہ ہے کہ سابقہ دونوں تصورات افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ دنیا سے کنارہ کش ہونا اور مذہب کو نجی زندگی تک محدود رکھنا یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اسلام کے تابع ہے۔ انسان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں وہ اس لئے دی گئی ہیں کہ بندہ ان کو خدا کی عبادت و اطاعت کے لئے استعمال کرے۔ اسلام ان صلاحیتوں اور قوتوں کو نہ بالکل آزاد چھوڑنا چاہتا ہے کہ ان پر کوئی پابندی ہی نہ رہے اور نہ ان کو کچلنا چاہتا ہے کہ یہ بالکل ناکارہ ہو جائیں۔ کمال دینداری یہ ہے کہ انسان کا ہر لمحہ خدا کی اطاعت میں بسر ہو اور دنیوی زندگی کے تمام شعبوں کو اللہ تعالیٰ کی

عطا کردہ ہدایات کے تابع کر دیا جائے۔ یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔

سوال نمبر ۱۰۱:۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ اسلام ہی عقلی اور فطری دین ہے

جواب:۔ اسلام نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے اس کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں خلاق عالم نے جو حقیقی قانون ساز بھی ہے پوری زندگی کے لئے احکام و قوانین بنائے ہیں۔ اسلام نے بنیادی عقائد و اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی صحیح ادائیگی کے لئے اجتماعیت کو اولین شرط قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر ان عبادات کو ادا کرنے سے وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے جو شریعت میں مقصود ہیں۔ اجتماعیت کے بغیر اسلامی احکام کی ادائیگی کا کوئی امکان نہیں۔ اسلام میں رہبانیات سے بے تعلقی کا اعلان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

"وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" (الحدید۔ ۲۷)

اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہے ہم نے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

حدیث میں فرمایا:۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رہبانیت کی تعلیم کسی آسمانی مذہب میں کبھی نہیں دی گئی جس طرح دین میں رہبانیت کیلئے کوئی جگہ نہیں اور اس کے عقائد و اعمال بھی اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اسی طرح اسلام کی تفصیلی تعلیمات بھی رہبانیت کے خلاف ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس کام سے منع فرمایا جو کسی حد تک بھی رہبانیت سے ملتا جلتا یا اس کی طرف لیجانے والا تھا۔ مثلاً شادی بیاہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ ہمیشہ روزہ سے رہنا، خاموشی اختیار کرنا یا راتوں کو جاگتے رہنا یا ایسی عبادات اختیار کہ تا جن کی بنا پر جسم راحت و آرام سے محروم ہو جائے یا جس کے نتیجہ میں اہل و عیال کو ان کے ضروری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

ناقص دینداری کا تخیل بھی اسلام سے بہت بعید ہے۔ دین انسان کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے اگر دین اسلام کا نجی معاملہ ہوتا تو اس کی تعلیمات انسان کی انفرادی زندگی تک ہی محدود ہوتیں اور اسلام میں نماز، روزہ اور اخلاقی تعلیمات کے سوا دوسرا کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہدایات دیتا ہے۔ خدا کا ہر فرمان اور آنحضورؐ کا ہر ارشاد جزوِ دین ہے۔ ان کا کوئی حکم زائد اور غیر ضروری نہیں ہے۔ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسلامی احکام کی اطاعت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پھر اسلام کو انفرادی زندگی تک محدود رکھنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی اجازت ہے نہ اس کے احکام انفرادی زندگی تک محدود ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ایک کامل ضابطۂ حیات اور اجتماعی مسلک ہے۔ امتِ مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جس کا نصب العین اپنی پوری زندگی کو اسلامی اصول و ضوابط کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ اسلام ٹھوس حقائق کا آئینہ دار ہے۔ اس کا پیغام عالمگیر اور دائمی ہے۔ یہ تغیرِ زمان و مکان سے بدلتا ہے۔ یہ جغرافیائی اور قومی و لسانی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کے غیر متبدل حقائق کو بدل نہیں سکتے۔ یہ ایک ایسا کامل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی پہلوؤں کو پوری طرح محیط ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ رضائے الٰہی کے لئے جینے اور اسی کے لئے مرنے کا نام اسلام ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے جو عالم آخرت کو نصب العین بنا سکے اور کسی وقت اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ نہ اس کے مفاد پر کسی اور مفاد کو ترجیح دے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے قبول کرنا اخروی فلاح و نجات کا موجب ہے قرآن میں فرمایا:۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ — کیوں نہیں جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف

مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ۔ ۱۱۲)

کر دیا (اسلام قبول کیا) اور وہ نیک بھی ہے تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا اجر ہے اور نہ اس کا کوئی خوف ہی ہو گا۔ اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص کامل اخلاص اور نیک نیتی سے دین اسلام کو اختیار کرتا اور اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالتا ہے، وہ خدا کے یہاں اجر اور ثواب پائے گا، اور غم و ہم سے ہر طرح آزاد ہو گا۔

اسلام کی دنیوی برکتیں

سوال نمبر ۱۰۶:۔ اخروی اجر و ثواب کے علاوہ وہ کونسی دنیوی نعمتیں ہیں جن کا اسلام اپنے پیروؤں سے وعدہ کرتا ہے؟ مدلل لکھئے۔

جواب:۔ جو لوگ اسلام کی دعوت پر لبیک کہتے اور عملی زندگی میں اس کی تعلیمات کو معمول بناتے ہیں۔ اسلام ان سے فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی کا وعدہ کرتا ہے۔ اسلام کا وعدہ یہ ہے کہ اس کی پیروی کرنے والے آزادی، خوشحالی، عزو وقار اور اقبال مندی و سربلندی کی زندگی بسر کریں گے۔ انبیائے اکرام اپنی اپنی امت کو یہی امید دلاتے رہے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اسی وعدہ خداوندی کو دہرایا، فرماتے ہیں۔

"لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" اگر تم نے شکر گذاری کا رویہ اختیار کیا تو تمہیں مزید انعامات دوں گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب تک اس روش پر گامزن رہی خدا کا یہ وعدہ پورا ہوتا رہا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کو دنیا میں بڑی عزت و شوکت اور اقتدار حاصل ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

"یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" (البقرہ - ۱۲۲)

اے بنی اسرائیل! میں نے تم کو جو نعمتیں دی تھیں ان کو یاد کرو اور اس بات کو بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں دنیا کی سب قوموں پر برتری عطا کی تھی

جب بنی اسرائیل نے اس عز و امتیاز کو ترک کر دیا تو عزت و شوکت کے سب راستے ان پر مسدود کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

"وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ" ان پر ذلت اور مسکینی چھا گئی۔

قرآن کریم میں فرمایا :-

"اگر اہل کتاب تورات و انجیل پر عمل کرتے اور ان کی ہدایتوں کو اپناتے جو ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی تھیں تو رزق ان کے اوپر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی ابلتا"

(سورۃ المائدہ)

قرآن کریم اس ضمن میں یہ قانون بیان کرتا ہے۔

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (الاعراف - ۹۶)

اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلتے تو ہم ان کے اوپر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

جو لوگ ایمان و عبادت کا شیوہ اختیار کرتے ہیں ان کی شان میں فرمایا۔

"فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ" (آل عمران - ۱۴۸)

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بھی بہترین اجر فرمایا۔

یہ بات کسی طرح قابل تسلیم نہیں کہ دنیوی انعامات کی جو بارش امم سابقہ کے صلاح و اتقیا پر ہوتی رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کے بارے میں اپنا یہ ضابطہ بدل لیتا چنانچہ اس نے اس امت سے بھی دنیوی فلاح و بہبود کا وہی وعدہ کیا جو سابقہ امتوں سے

کیا تھا۔ یہ وعدہ مکہ کی زندگی میں بھی کیا جو مسلمانوں کیلئے بڑی صبر آزما تھی اور مدینہ منورہ میں بھی جہاں ہر وقت خطرہ کے بادل منڈلاتے رہتے تھے۔ دنیوی انعامات کے وعدہ میں مسلمان بھی شامل تھے اور وہ بھی جو ابھی تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ قریش مکہ کو ان الفاظ میں دعوت اسلام دی۔

"وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا" (ھود۔ ۳)

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی طلب کرو اور پھر اس کی طرف رجوع کرو تو وہ تمہیں زندگی کا اچھا سامان عطا کرتا رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان الفاظ میں دنیوی کامیابی و کامرانی کا یقین دلایا تھا

"اگر تم میرا پیغام قبول کر لو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا۔

"میں تو قریش کو ایک ایسی بات کی تلقین کرتا ہوں جس کی بدولت سارا عرب ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور سارا عجم ان کا باجگزار ہوگا۔"

قرآن میں اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا" (سورۃ نور۔ ۵۵)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ پہلے مومنوں کی طرح انہیں بھی ضرور زمین کی حکومت دے گا اور اپنے پسندیدہ دین کو ان کے لئے ضرور قائم کرے گا اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا۔

دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ یہ وعدہ کیسے پورا ہوا۔ عرب کے بادیہ نشین گڈریے

قوموں کی قسمت کے مالک بن گئے۔ مشرق و مغرب ان کے زیر نگیں ہو گیا۔ اس آیت میں دنیوی فلاح و صلاح کے لیے ایمان اور عمل صالح کو اسی طرح شرط قرار دیا گیا ہے جس طرح اخروی نجات کے لیے ایمان و عمل شرط ہے۔ ایمان و عمل کے بغیر نہ اخروی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ دنیوی کامیابی و کامرانی کے حصول کا امکان ہے۔

امت مسلمہ کے عروج و زوال کا انحصار اسی شرط پر ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" (آل عمران۔۱۳۹) سست مت پڑو اور غمگین مت ہو اگر تم مومن ہو تو تم ہی بلند ہو کر رہو گے۔

مسلمانوں کے دنیا میں سرسبز ہونے اور پھلنے پھولنے کا قانون دوسری قوموں سے مختلف ہے۔ دوسری قوموں کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ اپنی ذات میں کچھ اخلاقی اوصاف پیدا کر لیں اور ان مادی امور و اشیاء سے بہرہ ور ہوں جو ترقی کے لوازم ہی سکتے ہیں تو ان کو دنیا میں سربلندی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر امت مسلمہ کے لئے صرف مادی لوازم کا حصول ترقی کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت دنیا میں خدا کے دین کو سربلند کرنے اور دوسری قوموں کے سامنے حق کے پیغام کو پیش کرنے اور اس کی شہادت دینے کیلئے عالم وجود میں لائی گئی ہے۔ دنیا میں دوسری کوئی قوم اپنے سامنے ایسا بلند نصب العین نہیں رکھتی۔ نصب العین کے اختلاف سے حقوق اور ذمہ داریوں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ امت اپنے اوپر جو کڑی ذمہ داریاں رکھتی ہے دوسری کوئی قوم نہیں رکھتی یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی دوسری قوم حق کی راہ سے منحرف ہو گی تو اس کا یہ جرم اس قدر گھناؤنا اور قابلِ نفرت نہ ہو گا۔ اس کے مقابلہ میں اگر یہ امت اس جرم کی مرتکب ہو گی۔ تو اس کا گناہ زیادہ شدید اور نفرت و حقارت کے لائق ہو گا۔ دوسری قومیں خدا کی نافرمان ہوتے ہوتے بھی دنیا میں خوشحال و کامران ہو سکتی ہیں مگر اس امت کو یہ رعایت حاصل نہیں اور یہ عین تقاضائے عدل و انصاف ہے اس لئے کہ جو شخص جس قدر انعامات خداوندی سے

سرفراز ہوا ہے ان کی ناشکری اور ناقدردانی کی صورت میں وہ اسی قدر معتوب بھی ہو تا ہے۔

سوال نمبر ۱۰:۔ مذہب تو دنیا سے بے رغبتی کی تعلیم دیتا ہے پھر یہ بات کس طرح درست ہے کہ مذہب پہ عامل ہونے سے دنیوی فارغ البالی حاصل ہوتی ہے؟

جواب:۔ اسلام کی تعلیم خصوصیت یہ ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہ دنیوی ساز و سامان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دولت و ثروت جاہ و عزت، قوت و شوکت ان میں سے کوئی چیز بھی بجائے خود اسلام میں معیوب نہیں بلکہ یہ انعامات خداوندی ہیں۔ قرآن میں ان کو فضل الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا کی دوئی کا تصور نہیں ہے۔ دنیوی معاملات کو دین کی روشنی میں انجام دینے کا نام دین ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔

"رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" اے ہمارے پروردگار تو ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی بھلائی باہم لازم و ملزوم ہیں۔ آخرت کی کامیابی کا راستہ دنیا میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کسی اور راستہ سے آخرت تک پہنچ جائیں۔ لہٰذا دنیوی زندگی کا راحت و آرام، اچھا لباس، اچھی خوراک، عمدہ رہائش پاکیزہ روزی اور حلال و طیب رزق۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مذمت کے قابل نہیں۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا:۔

"اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب اس نے تم میں سے انبیاء پیدا کئے اور تمہیں سلطنت و حکومت سے سرفراز کیا۔ (سورۂ مائدہ ۵)

سورۂ نحل میں دنیوی راحت و آرام اور خوشحالی کی زندگی کو "انعم اللہ"

(خدا کی نعمتیں) کہا گیا ہے۔ سورۂ جمعہ میں اس کو "فضل" قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔
"وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ" (الجمعۃ) اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی فضلِ ربی ہے تو پھر قرآن و حدیث میں طلب دنیا کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ نیز یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ مومنِ کامل وہ ہے جو ہمیشہ آخرت پر نگاہ رکھے اور اس کو دنیا پر ترجیح دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس دنیا کی مذمت کی گئی ہے وہ اور ہے اور جس کو فضلِ خداوندی کہا گیا ہے وہ دوسری چیز ہے۔ کتاب و سنت میں اس دنیا کو مذموم ٹھہرایا گیا ہے جو خدا سے غافل کر دے اور جس کے تقاضوں میں الجھ کر انسان احکام شریعت ادا کرنے سے قاصر رہے۔ مگر جو چیزیں شرعی احکام کی ادائیگی سے روکنے کی بجائے مددگار ثابت ہوں وہ ترک کرنے کے قابل نہیں بلکہ محبوب و مطلوب ہیں۔

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر ان چیزوں کو کسی جگہ "حَسَنَۃ" کہا کہیں "حیاۃً طیبۃً" اور دوسرے مقام پر "ثوابُ الدنیا" سے تعبیر فرمایا۔ مولانا جلال الدین رومی دنیا کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن ... نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

مطلب یہ ہے کہ دنیوی ساز و سامان مثلاً سونا چاندی اور بیوی بچوں کا نام دنیا نہیں ہے۔ دنیا یہ ہے کہ آدمی خدا سے غافل ہو جائے اور اس کی طاعت و عبادت پر کاربند نہ رہے۔ ایک مومن کے لئے وہی چیز دنیوی فلاح و بہبود کا باعث ہو سکتی ہے جو شرعی احکام کی ادائیگی سے مانع نہ ہو۔ جو چیز خدا کی اطاعت سے روک دے وہ کتنی ہی پرکشش اور دلفریب کیوں نہ ہو ایک سچے مسلمان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا سے غفلت اور دین سے بے تعلقی کے سوتے نفسِ انسانی سے پھوٹتے ہیں۔ کوئی چیز ایسے خدا سے غافل نہیں کرتی بلکہ وہ خود دانستہ غفلت کی تیز سوجاتا ہے۔ ایک

ہی چیز کے اثرات دو انسانوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ ایک معمولی شخص تھوڑی سی جاہ یا دولت پاکر دین سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص تخت سلطنت پر فائز ہو کر بھی دین کی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرتا۔ مسلم سلاطین و خلفاء وقت کی عظیم ترین سلطنتوں کے حکمران ہونے کے باوجود خدا سے غافل نہ ہو سکے اس لئے یہ حقیقت ہے کہ دولت و ثروت یا قوت و شوکت میں سے کوئی چیز بھی بذات خود قابل احتراز نہیں۔ در اصل انسان کا غلط طرز عمل اور طرز فکر ہی اس کو دین کی راہ سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ چونکہ مومن خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو کبھی بھی غلط طریقہ سے استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو رضائے الہٰی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے دنیوی انعامات ایک سچے مسلم کے لئے مذموم نہیں بلکہ محبوب و مطلوب ہیں۔

آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دینے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کو طلب کرتے وقت یا اس کے حصول کے بعد اس کو استعمال کرتے وقت دین کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ دنیوی امور کو اس طریقہ سے انجام دیا جائے کہ اخروی مفاد کو ٹھیس نہ لگے۔ شرعی حدود میں محدود رہ کر دنیا سے استفادہ کیا جائے۔ آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دینے کے ساتھ ساتھ مومن کے لئے دنیوی فلاح و کامرانی کی راہ بھی کھلی ہے۔ اسلام نے جہاں مومن کا اصلی نصب العین آخرت قرار دیا وہاں اخروی فلاح کا جو راستہ بتایا وہ دنیوی کامیابیوں سے کترا کر نہیں جاتا بلکہ دنیا کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مگر فائدہ دنیا سے بھی حاصل کیا جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس سے محروم نہ رکھا جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسان کو اس دنیا میں خدا کا خلیفہ و نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ خلیفہ خداوندی ہونے کے اعتبار سے اس خطۂ ارضی پر انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ زمین کا انتظام سنبھالے اور اسے اپنے مالک کی رضامندی و خوشنودی کے مطابق چلائے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دنیوی جاہ و عزت اور دولت و اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو۔ اسی لئے تمام چیزیں جو "اللہ کا فضل" اور اس کی "نعمت" ہوں وہ اس کے نیک بندوں کے لئے ممنوع قرار دی

سکیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (الاعراف۔ ۳۲)

فرما دیجئے کہ یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں (دراصل) اہلِ ایمان ہی کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے لئے ہوں گی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں پھر یہ چیزیں ان کے ناپسندیدہ کیونکر ہو سکتی ہیں؟ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ خلیفۂ خداوندی ہونے کے تقاضے کیا ہیں؟ جب اللہ تعالیٰ نے اس لئے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے کہ وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے۔ اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے اس فرض کا احساس رکھنے والے لوگوں کی موجودگی میں زمین کا اقتدار ان لوگوں کو عطا کیا جائے جو اس فرضِ منصبی کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو خدا کا نائب تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ بات حکمتِ خداوندی اور اس کے عدل و انصاف سے بہت بعید ہے۔ کہ زمین کا اقتدار ان لوگوں کو سونپا جائے جو اس کائناتِ ارضی پر خدا کی حاکمیت کی بجائے کسی اور کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ" (الانبیاء۔ ۱۰۵)

زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔

یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کے فرمانبردار بندے بذاتِ خود بھی خلافتِ ارضی کے کاموں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اپنے فرضِ خلافت کی ادائیگی سے قاصر رہیں گے۔ حالانکہ یہ ان کی زندگی کا حاصل ان کا اولین فرض بلکہ ان کی زندگی کا مقصدِ وجود ہے۔ خلافتِ ارضی کے تعلقات کا انجام دینا ان کے لئے ایک پسندیدہ فعل ہی نہیں ایک اہم فریضہ بھی ہے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے۔ کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی کامرانی و شادمانی کا بھی حقدار اور طلبگار ہوتا ہے۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا

سوال نمبر ۱۰:۔ اسلام کی امتیازی خصوصیات قلمبند کیجیے۔

جواب :۔ سابقہ مباحث سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ اسلام دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دین کامل ہے کہ جس میں کوئی کمی اور نقص نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ پوری کائنات کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ اخروی نجات حاصل کرنے کے لئے اس کی پیروی ضروری ہے۔ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع و کامل دعوت کے بعد اب کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ یہ ہدایت دائمی ہے۔ اور ہر زمان و مکان کے لئے کافی ہے۔ اب ذیل میں تفصیلاً اسلام کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ عالمگیر نبوت :۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالمگیر نبوت لیکر تشریف لائے تھے۔ آپؐ کی رسالت زمان و مکان کی تنگنائیوں میں محدود نہیں۔ آپ کسی خاص خطۂ ارضی کسی خاص عرصہ یا کسی خاص قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ آپ پوری کائنات کے لیے خدا کا آخری پیغام لے کر مبعوث کئے گئے تھے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا" (سورہ سبا ۲۸) ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کا اعلان کیا تھا۔

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (الاعراف ۱۵۸) لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں آپؐ تمام سابقہ انبیاء سے منفرد ہیں۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً" (بخاری و مسلم) مجھ سے پہلے ہر نبی کو اس کی مخصوص قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن مجھے

تمام لوگوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ ابدی نبوت :۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جسطرح عالمگیر ہے اسی طرح ابدی اور دائمی بھی ہے۔ آپ کی ذات پر رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اب قیامت تک کوئی نیا رسول پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں فرمایا۔

"وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ" (الاحزاب۔ ۴۰)

بلکہ وہ اللہ کے رسول اور انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔

اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ ہیں۔

"خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ" (بخاری و مسلم)

مجھ سے قصر نبوت کی تکمیل ہو گئی اور میرے ذریعہ رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

۳۔ دین کامل :۔ یہ دین ہر لحاظ سے کامل ہے اس میں کوئی خامی اور نقص نہیں۔ سابقہ شریعتوں میں سے کسی کو بھی یہ امتیاز نہیں ملا یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ دین کامل ہو۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" (المائدہ ۔ ۳)

لوگو! آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے اسلام کو پسند کر لیا

اس آیت سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ دین اسلام ہر لحاظ سے اتم و اکمل اور خدا کا پسندیدہ دین ہے جس میں کوئی خامی اور کوتاہی نہیں پائی جاتی۔ اس سے پہلے جتنے مذاہب بھی تھے وہ کسی نہ کسی طرح محدود و مقید تھے۔ مثلاً کسی خاص قوم تک یا مخصوص سرزمین تک یا متعین زمانہ تک۔ جسطرح ان کے مخاطبین کا دائرہ محدود تھا اسی نسبت سے اس کی تعلیمات میں بھی زیادہ وسعت نہ تھی جب مشیت ایزدی کا تقاضا ہوا کہ ایک ہمہ گیر پیغام بھیجا جائے۔ جو ابدی ہو اور پوری کائنات کے لئے ہو تو اس فیصلے کے پیش نظر ایسے دین کا نازل کرنا ضروری تھا جس کا مزاج بین الانسانی ہو۔ اور اس کی تعلیمات ہر زمانہ ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں مذکورہ

صدرِ آیت اسی فطری ضرورت کی تکمیل کا پتہ دے رہی ہے۔

۳۔ حفاظتِ قرآن :۔ دینِ اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب اتاری گئی وہ چودہ صدیاں گذر نے کے باوجود ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی۔ یہ کتاب لاکھوں حفاظ کے سینہ میں محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے اتارنے والے نے لیا ہے۔ اس کتاب کی زبان ایک زندہ و پائندہ زبان ہے۔ کروڑوں انسان دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسے بولتے، پڑھتے اور سمجھتے ہیں یہ کتاب اس بارے میں منفرد اور یگانہ ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب ان صفات سے موصوف نہیں۔ یہ کتاب چودہ سو سال سے کائناتِ ارضی پر بسنے والے انسانوں کو چیلنج دیتی آرہی ہے کہ جو اسے کلامِ ربانی نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ انسانی کلام ہے وہ ایک چھوٹی سی سورت ہی بنا لائیں۔ مگر آج تک کوئی شخص اس کے چیلنج کو قبول نہیں کر سکا۔ عربوں میں بڑے بڑے خطیب و ادیب قسم کے لوگ موجود تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں دوسروں کو عجم (گونگ) کہہ کر پکارتے تھے مگر قرآنی بلاغت نے ان کو مہر بلب کر دیا۔

یہ اسلام کی چند خصوصیات ہیں ورنہ اس کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔

سوال نمبر ۱۰۹ :۔ دینِ اسلام جن امتیازی خصوصیات سے بہرہ ور ہے ان کے تقاضے کیا ہیں؟ تفصیل سے لکھئے۔

جواب :۔ دینِ اسلام کی یہ خصوصیات اپنے ساتھ کچھ لازمی تقاضے بھی رکھتی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ نسخِ ادیانِ سابقہ :۔ اسلام کی امتیازی حیثیت کا پہلا فطری تقاضا یہ ہے کہ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اب خدا کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — بے شک اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے

(آل عمران۔ ۱۹)

اس آیت کی روشنی میں یہ مزید ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے

لوگ صرف اسلام ہی کی پیروی کریں۔ قرآن میں فرمایا

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا	اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب
فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ"	ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے
(آلِ عمران ۔ ۸۵)	یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ۔

چونکہ یہ دین پوری کائنات کے لئے نازل کیا گیا اور اس کے لانے والے کو پوری نوع انسانی کے لئے رسول قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا نہ اب کسی نئے دین کی گنجائش ہے نہ نئے پیغمبر کی ضرورت۔ رسول دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ لوگ اسے خدا کا فرستادہ مانیں اور بلا توقف اس کے احکام کی پیروی کریں۔ قرآن میں فرمایا۔

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ	ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا
بِإِذْنِ اللّٰهِ" (النساء ۔ ۶۴)	کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے

۲۔ آپؐ کی رسالتِ عامہ پر ایمان: آنحضورؐ کی عالمگیر رسالت اور خاتم الانبیاء ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر زمانے کا انسان آپؐ پر ایمان لائے۔ اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر اس کی پیروی کرے۔ جو شخص آپؐ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا وہ آپؐ کا نافرمان نہیں۔ بلکہ اس خالق کائنات کا باغی ہے۔ جس نے آپؐ کو پوری دنیا کا رہنما و پیشوا بنا کر بھیجا۔ آپؐ کے عمل سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام ہی کی پیروی لازم ہے۔ اگر قرآن کے نزدیک موجودہ دور کے سب مذاہب سچے ہوتے اور کسی ایک نبی کی پیروی اخروی فلاح و نجات کی ضامن ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے کیونکہ ان کے پاس ایک آسمانی کتاب موجود تھی۔ اور وہ ایک سچے نبی کے پیرو ہونے کے دعویٰ دار تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو شاید ان کو اسلام لانے کے لئے نہ کہتے بلکہ تورات و انجیل کی سچی پیروی کا حکم دیتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپؐ نے اہل کتاب کو اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح مشرکین عرب کو آپؐ نے ان کیلئے اپنی پیروی کو اسی طرح لازم قرار دیا جس طرح مشرکین کے لئے آپؐ کی اطاعت ضروری تھی۔ قرآن میں فرمایا۔

"یاایہاالذین اوتوالکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا او نلعنہم"
(سورۂ نساء - ۴۷)

اے اہل کتاب۔ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اتارا ہے جب کہ وہ اس کتاب کے عین مطابق ہے جو تمہارے پاس ہے اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انہیں پیچھے کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کو نہ صرف دعوت اسلام دی بلکہ جن لوگوں نے آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا انہیں صریح الفاظ میں کافر ٹھہرایا۔ بلکہ بعض جگہ ان کے انکار اسلام کو "بد ترین کفر" اور انہیں "پکا کافر" کہہ کر پکارا۔ قرآن میں فرمایا:

"جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروں کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کوئی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ پکے کافر ہیں ایسے کافروں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے" (سورۂ نساء ۱۵۰-۱۵۱)

اہل کتاب کے انکار اسلام پر ایک جگہ قرآن میں یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی تھی اور اس طرح وہ ہدایات خداوندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں" (البقرہ)

دعوت اسلام کے جواب میں اہل کتاب یہ طرز استدلال اختیار کرتے ہیں کہ آخر ہمارے پاس بھی تو آسمانی کتاب ہی ہے پھر اس کی پیروی کیوں نہ کریں؟ کیا اس کی اطاعت میں فلاح و نجات نہیں؟ آخر اس کتاب کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے کسی اور کتاب کی اطاعت کیسے ضروری ہو گئی؟ جب کہ یہ کتاب اپنی جگہ سچی ہے اور مسلمانوں کی کتاب اپنی جگہ برحق ہے قرآن نے ان کے اس فلسفہ کو کفر کا فلسفہ اور باطل استدلال قرار دیا۔ قرآن اہل کتاب کے اس انداز فکر کو ٹھکرا دیتا ہے کہ "یہ بھی حق وہ بھی حق"

۳۔ قرآن کا ناسخ الکتب ہونا جب اس کرۂ ارضی پر سرے سے ایسی کوئی آسمانی کتاب

ہی موجود نہیں جو تغیر و تبدل سے پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی زبان زندہ و پائندہ ہو تو پھر دوسری شریعتوں اور کتابوں کی پیروی کیونکر ممکن ہے جب ان کتابوں کا غیر محفوظ ہونا بذاتِ خود اس بات کا اعلان ہے کہ اب وہ قابلِ اطاعت نہیں رہیں۔ ان کی اطاعت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اور اب وہ منسوخ ہیں۔

جب ہر شخص کے لئے اسلام ہی کی پیروی ضروری ٹھہری اور اس کے سوا کوئی اور دین خدا کا پسندیدہ دین نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اسلام کی پیروی کے سوا کسی شخص کی نجات ممکن نہیں۔ جب پہلی شریعتیں خدا نے منسوخ کر دی ہیں تو اب ان کی پیروی پر اجر و ثواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا ہے "وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" ایسا شخص آخرت میں ناکام رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے جس شخص تک میری رسالت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا" (صحیح مسلم)

جب یہود و نصاریٰ پر اہلِ کتاب اور ایک آسمانی دین کے حامل ہونے کے باوصف آپ کی دعوت پر ایمان لانا ضروری ہے تو جو قومیں سرے سے آسمانی کتاب اور دین کو مانتی ہی نہیں۔ ان کے لئے آپ کی اطاعت اور بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اقوامِ عالم میں سے صرف یہود و نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن نے اہلِ کتاب کہہ کر پکارا ہے۔ جب اہلِ کتاب کیلئے آپ کی رسالت پر ایمان لانا شرطِ نجات ہے تو دوسری قوموں کے لئے جو اہلِ کتاب نہیں یہ فریضہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے دو ٹوک اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی پیروی کو پوری انسانیت کے لئے مدارِ نجات قرار دیا ہے۔ صرف وہ شخص اس حکم سے مستثنیٰ ہے جس تک اسلام کی دعوت ہی نہ پہنچی ہو۔ دعوتِ اسلام کو ہر شخص تک پہنچانا اور شہادتِ حق دینا امتِ مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

سوال نمبر ۱۱: امت مسلمہ کے فرائض اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالئے۔

جواب: یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ دین اسلام ایک ہمہ گیر کامل اور آخری دین ہے جس کی ہدایات و تعلیمات پوری انسانیت کے لئے ہیں۔ اس کی اطاعت مدار نجات ہے اخروی فلاح و بہبود کا انحصار صرف اسی کی پیروی پر ہے۔ اسلام کی اس امتیازی حیثیت کا تقاضا ہے کہ اس کی دعوت کو عام کرنے کیلئے سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے پیغام کو دنیا کے چپہ چپہ میں پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ دنیا کی ہر قوم تک اس کا پیغام پہنچایا جانا چاہیے۔ کوئی فرد اس کی دعوت سے بیگانہ نہ رہنے پائے۔ اس لئے کہ جو شخص اس کے پیغام سے آشنا نہ ہوگا۔ وہ اس پر ایمان کیونکر لائے گا۔ ایمان سے پہلے پہچان کی ضرورت ہے۔ یہ بات بعید از انصاف ہے کہ جو شریعت دنیا میں پھیلانے اور ہر جگہ پہنچانے کے لئے آئی ہے وہ لوگوں کے لئے راز سربستہ بنی رہے۔ اور انہیں بے خبری میں پکڑا جائے۔ اگر انسانیت پر اسلام کی پیروی ضروری ہے تو پیروی سے قبل اس سے آگاہی لازم ہے اگر دعوت اسلام کو پھیلانے کا کما حقہ اہتمام نہ کیا جائے تو اسلام بیگانہ ہو کر رہ جائے گا جو اس پر ظلم ہے اور اگر انسانیت کو اسلامی دعوت سے آگاہ کرنے کی فکر دامنگیر نہ ہو تو اس عظیم نعمت سے اس کی محرومی یقینی ہے جو ظلم سے کسی طرح کم نہیں۔

جب تک داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بقید حیات رہے امکانی حد تک اشاعت اسلام کا اہتمام کرتے رہے۔ آپ کے بعد بھی اسلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا یہ ضروری حق ادا کیا جاتا رہے۔ اسلام تا قیام قیامت اس فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا رہے گا۔ اب تو رسالت و نبوت بھی ختم ہو چکی ہے۔ کوئی نبی آکر بھی یہ فریضہ ادا نہیں کرے گا۔ اشاعت اسلام کا سوال امت مسلمہ کے لئے ایک بڑا نازک مسئلہ ہے۔ اسلام اگر خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے ساری دنیا کے لئے اور ہمیشہ کے لئے بھیجا گیا ہے تو اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہیے۔ قرآن کریم

اس عظیم مسئلہ کا حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" (البقرہ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانی امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کیلئے شاہد بنو اور ہمارا رسول تمہارے سلئے شاہد ہے۔

اس آیت کی روشنی میں اس حل کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے کہ:۔

۱۔ اشاعتِ اسلام کا جو کام حضورؐ بنفسِ نفیس کرتے تھے اب وہ مسلمانوں کے ذمے ہو گیا ہے۔ یہ لوگ جب تک اس کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔ اس کام کے ذمہ دار ہیں۔

۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب صرف عام طرز کی تبلیغ ہے جسے "شہادت" کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ اسلام کی شہادت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کو لوگوں تک بالکل اسی طرح پہنچایا جائے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

مذکورہ صدر بیان سے واضح ہوا کہ امم سابقہ پر صرف ایک ہی ذمہ داری تھی کہ کامل خلوص کے ساتھ اپنے دین کی پیروی کرتی رہیں۔ امتِ مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک اور ذمہ داری بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے۔ چونکہ یہ امت مجموعی حیثیت سے اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔ اس لئے اس کی زندگی کا مشن وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔

امتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری اس قدر اہم ہے کہ وہی اس امت کا مقصدِ وجود بھی ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

تم ایک بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی امتوں کی طرح یہ ایک عام امت نہیں ہے۔

بلکہ ایسی امت ہے جو ساری نوعِ انسانی کی رہنما اور پوری انسانیت کی پیشوا بنائی گئی ہے
یہ اس امت کی زندگی کا اولین مقصد بھی ہے اور آخری بھی۔ اس امت کی وقعت و اہمیت
اس فریضہ کی ادائیگی سے وابستہ ہے یہ جب تک دنیا کے سامنے حق کی گواہی دیتی رہے
گی اس وقت تک "خیر امت" اور "امتِ وسط" رہے گی۔ ورنہ ان القاب و آداب سے
یکسر محروم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ یہ صفاتی نام اس امت کو اپنی ذمہ داریوں کی بنا پر
دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

"اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ
ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی تمہارا نام مسلم رکھا ہے تاکہ رسولؐ تمہارے لئے
(دینِ حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے لوگوں کے لئے شاہد ہو" (الحج ۔ ۷۸)

اس آیت میں جہاں امتِ مسلمہ کا نام اور مقام بتایا وہاں اس کے مشن سے بھی آگاہ کیا
جو اس کو تفویض کیا گیا ہے۔ یہ جب تک اس فریضہ کو انجام دیتی رہے گی اس نام سے موسوم
رہے گی۔ یہ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کے لئے خدا کے حضور جواب دہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ
بارگاہِ ربانی میں جہاں ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہی
کرنی ہو گی وہاں پوری امت کو بحیثیت مجموعی (اجتماعی جواب دہی بھی) کرنی پڑے گی۔ یہ اسی قسم
کی جواب دہی ہے جیسے انبیاءؑ بحیثیت نبی ہونے کے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ گویا
یہ ایک پیغمبرانہ مسؤلیت ہے۔ اس لئے کہ گو امتِ مسلمہ اصطلاحاً "نبی نہیں مگر پیغمبری کی ذمہ داری
(تبلیغ) ضرور رکھتی ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ"	جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ان سے بھی سوال کریں گے اور پیغمبروں سے بھی حساب لیں گے۔
(الاعراف ۔ ۶)	

شہادتِ حق

سوال نمبر ۱۱۱۔ جس "شہادتِ حق" کو امتِ مسلمہ اور انبیاءؑ پر فرض کیا گیا ہے اس

کی حقیقت بیان کیجئے۔

جواب:- شہادت کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جو بات کسی کو یقینی طور سے معلوم ہو وہ صحیح طور پر دوسروں کو بتا دے۔ دین حق کی شہادت کا لغوی و عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر ٹھیک ٹھیک اسلام کو واضح کر دیا جائے۔ اصطلاحی اعتبار سے شہادت حق کے مفہوم میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(الف) قولی شہادت :- قولی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد و احکام کو پوری دنیا کے سامنے اس وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا جائے کہ اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے اور اس کی صداقت ہر ایک پر واضح ہو جائے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی اپنے مسلک کی غلطی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ اور اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ قولی شہادت کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کی ضرورت ہے

۱۔ اسلام کی صداقت و حقانیت عقلی دلائل کی روشنی میں واضح کی جائے۔ اسلام کے بنیادی مسائل مثلاً توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ کو فطرت و وجدان کی شہادت سے مبرہن و مدلل کیا جائے اور بتایا جائے کہ اسلام انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات کیلئے واضح ہدایات دیتا اور ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

۲۔ اسلام کی صداقت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بنظر غائر دیگر مذاہب ان کے افکار و آراء اور نتائج کا مطالعہ کر کے ان پر بھرپور تنقید کی جائے۔ جب تک غیر مذاہب کے نظریات کو تنقید کے تیروں سے چھلنی نہ کیا جائے اسلام کی صداقت واضح نہیں ہوتی اس لئے غیر اقوام پر اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لئے تنقید کے مرحلہ سے گذرنا از بس ضروری ہے۔

۳۔ اسلام کی تائید اور دیگر مذاہب کی تردید کے لئے مناظرانہ و معاندانہ طرز بیان کی بجائے دل نشین اور شیریں طرز و انداز اختیار کیا جائے۔ طرز استدلال اور انداز بیان ایسا ہو جو اذہان و قلوب کو اسلام کی طرف مائل کر سکے۔ گفتگو کا انداز ایسا ہو جس سے

آج کل کے لوگ مانوس ہیں۔ دلائل میں ایسی معقولیت ہو جسے مانتے ہی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو۔ اس لئے کہ یہ کوشش جدل و بحث کی خاطر نہیں بلکہ دینِ حق کا نام روشن کرنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے ہے۔ قرآن کریم نے دعوتِ اسلام کے لئے انتہائی معقول طریق بحث اور نہایت مانوس و معیاری زبان و بیان اور طرزِ استدلال اختیار کیا ہے۔

غرض تبلیغ میں حکمت و مصلحت شیریں طرزِ ادا اور دل نشین پیرایۂ بیان کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ یہ پیغمبرانہ طرزِ دعوت و ارشاد ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ"	اے پیغمبرؐ! اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلایئے اور بہت اچھے طریقہ سے بحث کیجئے۔

۴۔ مبلغ میں خلوص کا جذبہ کارفرما ہو۔ جذبات کی جائے شفقت و محبت خیر خواہی اور احساسِ فرض کے پیشِ نظر کہی جائے۔ دعوت وارشاد میں کبر و غرور، حریفانہ کد و کاوش اور مناظرانہ ذوق کا کوئی شائبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

(ب) عملی شہادت :۔ عملی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ مبلغ منہ سے جو بات کہے عمل سے اس کی تائید پیش کرے۔ وہ صرف گفتار ہی کا غازی نہ ہو بلکہ کردار کا بھی دھنی ہو۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اور پوری امت اجتماعی طور پر اسلام کا عملی نمونہ ہو۔ اسلام کے افکار و عقائد ان میں رچے بسے ہوئے ہوں اور ان کی صداقت ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہی ہو۔ ان کی زندگی کا ایک ایک شعبہ اسلام کی ترجمانی کر رہا ہو۔ عملی شہادت کا درجہ قولی شہادت سے بڑا ہے۔ جب تک کوئی شخص یا گروہ دین کی کسی بات پر عمل نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کا حکم دے۔ ایسا شخص اگر حکم دے گا بھی تو اس کی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگی۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو اس وقت آپؐ پیکرِ ایمان و ایقان بن چکے تھے۔ جب دوسروں کو خدا کا حکم سنایا تو اپنا سر نیاز سب سے پہلے جھکا دیا۔ اس ضمن میں آنحضورؐ کے الفاظ یہ ہیں۔

"اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" میں سب سے پہلا ایمان لانیوالا ہوں
"اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" میں سب سے پہلا اطاعت کرنیوالا ہوں

آنحضورؐ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ آپؐ کوئی بات کہنے سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

یہ امر انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ پسماندہ و درماندہ اقوام کے طریق زندگی ان کے طرزِ فکر و نظر اور ان کے فکر و فلسفہ کو وقعت و اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اقوامِ عالم کو اسلام کا گرویدہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان علمی و اقتصادی ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی درماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں جذبۂ عمل اور جہد و سعی کا فقدان ہے۔ سہل انگاری و تغافل شعاری ان کی رگ و ریشے میں سرایت کر چکی ہے۔ جب تک مسلمان ان عاداتِ قبیحہ کو ترک نہیں کریں گے نہ ان کو دنیا میں فلاح و صلاح حاصل ہو گی نہ آخروی نجات و سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ مسلمان خود درماندہ و پسماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بھی رسوا ہوتا رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری قوموں کے لئے اسلام میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی بلکہ خود مسلمان بھی جادۂ اسلام سے منحرف ہو کر اپنے لئے زندگی کی نئی راہیں تلاش کرنے لگیں گے۔ یہی چیز ہے جو دورِ حاضر میں مسلم معاشرہ کو بربادی کے جہنم میں دھکیل رہی ہے مسلمان اسی وقت شہادتِ اسلام کا حق ادا کر سکتا ہے جب ہمت، جہد و سعی اور ایثار سے کام لے کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکالے۔

موانع اور ان کا سدِّ باب

سوال نمبر ۱۱۲:۔ شہادتِ حق کے سلسلہ میں جو موانع پیش آ سکتے ہیں انہیں دور کرنے کیلئے اسلام کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے "تفصیلاً" لکھیے۔

جواب:۔ کائناتِ ارضی خیر و شر کی رزم گاہ ہے۔ یہاں بھلائی اور برائی کی دونوں

قوتیں دنیا میں پھلتی پھولتی اور آزادی سے نشوونما پاتی ہیں۔ ان میں تصادم بھی ہوتا رہتا ہے یہ دونوں باہم برسرِ پیکار رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے قوت آزمائی کرتی رہتی ہیں اس لئے کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت شر غالب ہو کر اسلام کا راستہ بند کر لے اور تبلیغ واشاعت کی سب راہیں مسدود کر کے اس کو دنیا میں پہنچنے نہ دے۔ ہر دعوت کی تاریخ میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں۔

دعوتِ اسلام میں حائل ہونے والی ان رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اگر ان مشکلات کو دور نہ کیا جائے تو تبلیغ اسلام کا راستہ ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جائے۔ اشاعتِ اسلام کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے۔ اس کو "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ جہاد کے معنی ہیں کوئی کام انجام دینے کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اپنی ساری طاقت صرف کر دینا۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ صرف رضائے خداوندی، اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو انسان کے بس میں ہو۔ اس مقصد کی خاطر پوری قوت صرف کر دینے کا نام جہاد ہے۔ جہاد (کوشش) کی صورتیں بہت سی ہو سکتی ہیں۔ جس قسم کے حالات درپیش ہوں اسی قسم کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام نے مختلف حالات کیلئے جہاد کی تین مختلف شکلیں مقرر کی ہیں:-

۱۔ داخلی جہاد

۲۔ دعوتی اور فکری جہاد

۳۔ مسلح جہاد

اب جہاد کی ان تینوں قسموں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ داخلی جہاد :- اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جو برائیاں سر اٹھائیں کوشش کر کے انہیں ختم کر دیا جائے نیکیوں کو پھیلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ برائیوں کی وجہ سے اشاعتِ اسلام کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل حدیث کا ایک حصہ یہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا:-

"پس جس نے احکام خداوندی کو نظر انداز کرنے والوں کے خلاف اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے دل سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ موجود نہیں۔" (صحیح مسلم)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ مسلم معاشرے میں جو برائی اور ضلالت پیدا ہو اسے ختم کرنے کی کوشش کو "جہاد" کہتے ہیں۔

۲۔ اس حدیث میں آپ نے برائی کو ختم کرنے کی تین صورتیں بیان فرمائیں اور ان کا الگ الگ درجہ بھی بتایا۔

(الف)۔ برائی کو ختم کرنے کی افضل ترین صورت یہ ہے کہ اس کے خلاف قوت استعمال کر کے اس کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

(ب)۔ اگر برائی کو ہاتھ سے ختم کرنے کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کی مذمت کی جائے۔ اس پر کڑی تنقید کی جائے۔ آخرت کی سزا سے ڈرایا جائے۔ خدا کا قہر و غضب یاد دلایا جائے۔ جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو زجر و عتاب سے کام لیا جائے۔

(ج)۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ برائی کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ بارگاہِ ایزدی میں اس کو مٹانے کے لئے دعا کی جائے۔

مسلم معاشرے سے برائی کو مٹانے کی یہ تینوں عملی شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر صورت جہاد ہے۔ کیونکہ یہ بھی حق کو دنیا میں قائم رکھنے اور اس کی شہادت دینے کی ایک کوشش ہے۔ اور حق کی خاطر جدوجہد کو "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔

برائی کو مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد کہا گیا ہے دوسری حدیث میں ان کو "تغییر منکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی (منکر) دیکھے تو چاہیئے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس

کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے کوشش کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ اس کو نہی عن المنکر بھی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

"وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (سورۃ لقمان)	بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:۔

"ائْتَمِرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ"	ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرو اور برائی سے روکو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ امت کے افراد اس سے بری ہیں نہ ریاست۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم فریضہ کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (التوبۃ۔۷۱)	مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ایک مسلمان کی دائمی صفت ہے یہ ایمان و اسلام کے ساتھ لازم ہے جہاں مسلمان ہوگا وہاں یہ کام بھی ضرور کیا جاتا ہوگا۔ مسلمان جب قوت واقتدار پر فائز ہوں تو یہ امر ان کی ذمہ داری میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کی خصوصیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" (الحج۔۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے۔ زکوۃ دیں گے۔ بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس طرح انفرادی حیثیت میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ برائی ان کے سامنے پھلے پھولے اسی طرح مسند اقتدار پر فائز ہو کر بھی برائی کے وجود کو

گوارا نہیں کرسکتے۔ منکرات کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ان کے بنیادی مقاصد میں شامل ہو جاتا ہے۔

۲۔ دعوتی اور فکری جہاد:۔ دعوتی اور فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے جو دلائل پیش کیے جائیں ان کا شافی جواب دیا جائے ان کے شکوک وشبہات کی تردید کی جائے۔ اسی ضمن میں صبر و تحمل اور بردباری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ معاندانہ و مجادلانہ انداز بیان کی بجائے مشفقانہ طرز استدلال اختیار کیا جائے۔ مخالف عقل و استدلال کی جن قوتوں سے بھی کام لے ان کو تردید و تنقید کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے وہ جن آلات سے مسلح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہو ان کو کند کر دیا جائے۔ اس سلسلہ کو اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک مخالف کے تمام عقلی و علمی شکوک ختم نہ ہو جائیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سراسر جہاد تھی۔ قرآن میں فرمایا۔

"فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" (الفرقان۔۵۲)	آپ منکرین اسلام کا کہنا نہ مانیں اور قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کرتے رہیں۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے قرآنی دلائل سے اسلام کی صداقت و حقانیت واضح کریں۔ اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری عیاں کرتے رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو زبان کا جہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

"جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ" (ابوداؤد)	مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعے جہاد کرو۔

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ دعوتی اور فکری جہاد عقل واستدلال کے ہتھیاروں سے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ فکری جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک منکرین اسلام کے سب فکری قلعے مسمار نہ ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مشرکین عرب کے اعتراضات کی دھجیاں جس طرح فضائے آسمانی میں بکھیریں وہ محتاج بیان نہیں اس کے بارے میں قرآن کے یہ فیصلہ کن الفاظ کافی ہیں۔

"وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا" (الفرقان ۳۳) یہ لوگ جس قسم کا اعتراض بھی پیش کریں گے ہم اسکا برحق جواب اور بہترین وضاحت آپ کو بتا دیں گے۔

اس فکری جنگ کے لئے قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی ہے۔

"وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" جدل و بحث کیلئے احسن طریق اختیار کیجئے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ طرزِ دعوت اور طریقِ جدل و بحث بڑا مشفقانہ، دل نشین اور مدلل ہونا چاہیئے۔ اس میں مخاطب کے ذہن، عقل و فہم اور نفسیات کو پیش نظر رکھا جائے۔ بردباری اور صبر و تحمل اس جہاد کی شرطِ اولین ہے۔ داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ درشت کلامی، گالی گلوچ، ایذا رسانی اور مخالفت کا جواب عالی ظرفی دلسوزی، شفقت و محبت اور سنجیدگی کے ساتھ دے۔ قرآن کریم میں صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ" (آل عمران ۱۸۶) اور تمہیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی اور ایسے وقت تم نے صبر سے کام لیا اور تقوی کی روش پر جمے رہے تو بیشک یہ بڑے حوصلے کی بات ہوگی۔

ان آیات کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کا صبر و تحمل اور بردباری، بزدلی اور کم[illegible] کے ساتھ مصالحت کی حدود میں داخل نہ ہو جائے بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں میں جرأت و جلالت اور شجاعت و بسالت کا وجود بھی ضروری ہے قرآن میں فرمایا

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ" (الحجر ۹۴) جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کھل کر کہہ دیں اور مشرکوں کی پرواہ نہ کریں۔

۳۔ مسلح جہاد: یہ جہاد کی تیسری اور افضل ترین صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے اور اس کو پھیلنے سے

سے روکتے ہوں ان کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ مخالفین کے ساتھ جنگ و پیکار کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ لوگ دعوت و ارشاد کا راستہ کھلا نہ چھوڑیں۔ اس کے افضل الجہاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اس میں اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہ جہاد کی بہت کڑی اور صبر آزما قسم ہے۔ مسلح جہاد اسلامی ریاست کی قیادت میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست کے تحفظ و بقاء اور مسلمانوں کی جان و مال اور ناموس کو بچانے کے لئے مسلح جہاد ناگزیر ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ ۲۱۶)

مسلمانو! تم پر دین کی حفاظت فرض کر دی گئی ہے اگرچہ تم کو وہ ناگوار محسوس ہوتی ہو۔ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

جہاد کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ۔

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خدا کے لئے ہو جائے۔

اس آیت میں بتایا کہ مسلح جہاد کی غرض و غایت فتنہ کا انسداد ہے تاکہ خدا کے دین کی اشاعت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا راستہ کھل جائے اور اس میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ قرآنی اصطلاح میں "فتنہ" کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو خدا کی پیروی کرنے کا حق نہ دیا جائے اور انہیں معبود حقیقی کی بندگی سے روک دیا جائے۔ کسی کو خدا کی اطاعت و عبادت سے روکنا اتنا بڑا جرم ہے کہ خون ناحق کی بھی اس کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں۔ کسی کو قتل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے چند روزہ عیش و عشرت

سے روک دیا۔ اس کے برخلاف کسی کو خدا پرستی سے روکنے اور اپنے رب کا بندہ بننے سے ہٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حقیقی زندگی سے محروم کر اور اسے آخرت کی ابدی و دائمی نعمتوں کے قابل نہ رہنے دیا۔ بے شک کسی کو قتل کرنا بھی نہایت مذموم فعل ہے مگر خدا پرستی سے روکنا اس سے بھی عظیم تر جرم ہے۔

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ — فتنہ قتل سے بھی زیادہ بری چیز ہے

ایک اور آیت میں غرضِ جہاد ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ (الحج۔۴۰)

اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو صومعے، کلیسے عبادت گاہیں اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے اور اللہ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی ضرور مدد کرے گا

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر دین کی حفاظت کے لئے جنگ کر کے فتنہ کو ختم نہ کیا جائے تو دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر مخالفین اسلام سے لڑ کر فتنہ پروری کا انسداد نہ کیا جائے تو خدا کی زمین پر اس کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور خدا پرستی کے ایک ایک نشان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس لئے مسلح جہاد کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دعوتِ دین کے لئے جبر و تشدد استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ — دین میں جبر کی اجازت نہیں

مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے اسلام میں مسلح جہاد کی اجازت ہے۔

۱۔ دفاعی :۔ اعدائے دین جب مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو دین و مذہب مال و جان، ناموس و آبرو اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لئے اسلام میں جنگ کی اجازت ہے۔

۲۔ دفع فتنہ :۔ جب انسانوں کو ظلم کی آماجگاہ بنایا جائے۔ دعوت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں اور خدا کے بندوں کو خدا کے بجائے انسانوں کا غلام بنایا جائے تو شر اور فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقت کو استعمال کرنا درست ہے۔ اسلام شیطنت کی گردن کو توڑنے کے لئے تو طاقت استعمال کرتا ہے مگر کسی فرد یا گروہ کو بزور و جبر اسلام میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ ہر شخص کے سامنے دین کی صداقت واضح کر دی جائے۔ حق کو باطل سے نکھار دیا جائے۔ اب اسے اختیار ہے کہ حق کو قبول کرے یا اسے رد کرے۔ ہمارا فرض طاغوتی طاقتوں کو نیچا دکھانا، ظلم کی راہیں مسدود کرنا اور دعوتِ حق کو عام کرنا ہے۔ اس کے بعد جو شخص اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو وہ اس امت میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر رد کر دیتا ہے تو اسے یہ حق بھی حاصل ہے۔ دعوت حق کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص ذمی ہونے کی حیثیت سے اسلامی ریاست میں سکونت گزیں ہے تو اس کی جان و مال اتنی ہی محفوظ اور اس کی ناموس و آبرو اسی طرح قابل احترام ہے جس طرح ایک مسلمان کی۔ ہمارا کام اشاعت دین ہے۔ اگر ہم صحیح طور پر یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں تو ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اگر ہم اس فرض کو ادا کرنے میں سہل انگاری اور تغافل شعاری سے کام لے رہے ہیں تو ہم اس کے لئے بارگاہ خداوندی میں جوابدہ ہوں گے۔

رہنمائے

اسلامی نظریہ حیات

(سوالاً جواباً)

بمطابق جدید نصاب

برائے امتحان بی۔ اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

بتجدید نظر و اضافہ

غلام احمد حریری

ایم۔ اے (عربی)، ایم۔ اے (علوم
اسلامیہ)، ایم۔ او۔ ایل (عربی)،
فاضل السنہ شرقیہ۔ فاضل درس نظامی
علوم اسلامیہ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی
لائلپور

امتیاز احمد سعید

ایم اے (علوم اسلامیہ)
ایم۔ اے (عربی)، جے۔ ڈی۔ ڈبلیو
پی۔ ای۔ ایس شعبہ علوم اسلامیہ
گورنمنٹ کالج لاہور۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور

اردو بازار لاہور